پاکستان کی موجودہ المناک صورت حال: اسباب اور حل

۲ جولائی ۲۰۰۹ء کو ایک معروف ٹی وی چینل کے ایک پروگرام میں ملک کے ایک معروف صحافی نے ایک ایسے نوجوان خودکش حملہ آور کا انٹرویو ٹیلی کاسٹ کیا جسے پولیس نے حال ہی میں گرفتار کیا تھا۔ اس نوجوان کا تعلق لاہور سے ہے اور اس کے بقول اس نے 'میران شاہ' میں تربیت حاصل کی ہے۔ اس نوجوان کا کہنا یہ تھا کہ اس کے ٹریننگ کیمپ میں تقریباً تمام نوجوان پنجابی تھے اور صوبہ سرحد کے بعد ان کی کارروائیاں اب پنجاب اور سندھ خصوصاً کراچی میں بھی شروع ہونے والی ہیں اور عنقریب پاکستان پر ''طالبان'' کی حکومت ہوگی۔ اس نوجوان نے اپنے خیالات میں اس بات کا بھی اظہار کیا کہ اس کے فدائی حملے میں اگر دو افراد ٹارگٹ ہوں اور دو کی بجائے سو افراد بھی ہلاک ہو جاتے ہیں تو اسے اس کی بالکل بھی پرواہ نہیں ہے' یا اس کے اپنے گھر والے اور معصوم بچے بھی اس فدائی حملے کا نشانہ بن جاتے ہیں تو اسے افسوس نہیں ہوگا۔ اس نوجوان نے یہ بھی کہا کہ اگر وہ رہا ہو گیا تو پھر بھی یہی کام کرے گا' اور یہ کہ وہ پاکستان کے کسی عالم دین کو عالم نہیں مانتا۔ اس نوجوان کا کہنا یہ بھی تھا کہ پاکستان میں کوئی بھی بے گناہ نہیں ہے' اور جو بے گناہ ہیں وہ یا تو وزیرستان میں ہیں یا پھر کسی جہادی میدان میں ہیں۔ بعض لوگوں نے اس خیال کا بھی اظہار کیا ہے کہ یہ ویڈیو جعلی ہے۔ لیکن اگر اسے جعلی مان بھی لیا جائے تب بھی ہمارے معاشرے میں دائیں بائیں ایسے سینکڑوں نوجوان موجود ہیں جو اسی قسم کے نظریات رکھتے ہیں اور ان کو مذہبی جذبے کے ساتھ عام کر رہے ہیں اور اگر ان سے کسی موقع پر مکالمہ ہو تو انہی خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔

اس نوجوان کے ''متشددانہ'' نظریات' مسلمانوں کی تکفیر' عوامی اجتماعات میں خودکش حملوں' فدائی کارروائیوں کے ذریعے لوگوں کے قتل عام یا مسلح خروج کے ذریعے مسلمانوں کی باہمی قتل و غارت جیسے اقدامات سے اتفاق یا اختلاف اور اس کے جواز یا عدم جواز سے قطع نظر' یہ بات انتہائی اہم ہے کہ ان افکار و اعمال کے اسباب اور حل کا ایک سنجیدہ جائزہ لیا جائے۔ اس ویڈیو میں اس نوجوان نے اپنے افکار کے جس بنیادی سبب کا تذکرہ کیا ہے اور پھر اس کا حل بھی بتایا ہے وہ کافی معقول نظر آتے ہیں۔ اس نوجوان کا کہنا یہ تھا کہ لال مسجد کے ظالمانہ واقعے کے بعد اس کا رجحان جہادی تحریکوں کی طرف ہوا اور وہ وزیرستان ٹریننگ کے لیے چلا گیا۔ اس نوجوان کا کہنا یہ بھی تھا کہ وہ میٹرک پاس ہے اور وہ دینی مدرسے کا طالب علم کبھی بھی نہیں رہا۔ اس نوجوان نے یہ بھی کہا کہ وزیرستان میں اس کے ساتھ ٹریننگ حاصل کرنے

والوں میں تقریباً تمام ہی دنیادار لوگ تھے' نہ کہ کسی دینی مدرسے کے فارغ التحصیل۔ اسی ویڈیو میں پنجاب کے وزیر قانون نے اس نوجوان کے انٹرویو پر تبصرہ کے دوران کہا کہ حال ہی میں ایک اور خودکش حملہ آور شہباز نامی نوجوان پکڑا گیا ہے اور وہ لال مسجد کے واقعے کے وقت زیرو پوائنٹ میں ایک کپڑے کی دکان پر ملازم تھا۔ یعنی وہ نوجوان بھی لال مسجد کے ظلم وستم کے ردعمل کا ایک نتیجہ تھا۔ اسی طرح بعض دوسرے معروف کالم نگار بھی گاہے بگاہے اپنے کالموں میں ایسے نوجوانوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں کہ جن کے بہن' بھائی یا والدین سوات' باجوڑ یا وزیرستان میں اندھادھند بمباری کی وجہ سے شہید ہو گئے اور اس کے ردعمل میں ایک انتقامی جذبے نے ان کو جہادی تحریکوں تک پہنچا دیا۔ اس نوجوان نے اس ویڈیو میں یہ پیغام بھی دیا کہ اب بھی حکومت خودکش حملوں کے مسئلے کو کنٹرول کر سکتی ہے اگر وہ شریعت نافذ کر دے۔

پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا' صحافی برادران' دانشور طبقہ' اسکالرز اور علماء کا تقریباً اس بات پر اتفاق ہے کہ موجودہ خودکش حملے اور حکومتی اور فوجی اہلکاروں کے خلاف مسلح جدوجہد ریاستی ظلم وستم کا نتیجہ ہے۔ یہ ظلم وستم لال مسجد یا باجوڑ مدرسے پر حملے کی صورت میں ہو یا سوات وزیرستان میں فوجی کارروائی کی شکل میں' امریکہ کے افغانستان پر حملے میں لاجسٹک سپورٹ کی صورت میں ہو یا امریکن ڈرون حملوں پر خاموشی کی شکل میں' ہر دو صورتوں میں اس سے حکومت پاکستان کے خلاف جہادی کارروائیوں میں اضافہ ہی ہوا ہے اور اب یہ عمل رکتا نظر نہیں آ رہا۔ اب تک تو مجاہدین پرنٹ میڈیا کا سہارا لیتے تھے لیکن اب انہوں نے عام شہریوں پر ہونے والے ظلم وستم' جہادی ترانوں اور جہادی کارروائیوں پر مبنی ہزاروں گیگا بائٹ کا ڈیٹا ویڈیوز کی صورت میں عام کرنا شروع کر دیا ہے' اور جو نوجوان بھی ان ویڈیوز سے ایک دفعہ گزر جاتا ہے اس کے لیے اس ظلم کے جواب میں صبر کا موقف اختیار کرنا ممکن نہیں رہتا۔ اس لیے اگر کچھ لوگ ظلم وستم کے نتیجے میں صبر کی تلقین کر بھی رہے ہیں تو یہ وعظ ونصیحت بھی کوئی نتیجہ خیز ہوتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ آئے روز ایسے نوجوانوں کی تعداد میں اضافہ ہی ہو رہا ہے جو پاکستان کو انتظامی طور پر کمزور کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے کچھ بھی کر گزرنے کو تیار ہیں' چاہے وہ شرعاً جائز ہے یا نہیں۔ ہمیں اس حقیقت کو مان لینا چاہیے کہ جب تک ریاستی ظلم وستم باقی ہے یا جب تک شریعت نافذ نہیں ہو جاتی' خروج کی ممانعت کی کسی شرعی دلیل یا صبر کی تلقین سے ان نوجوانوں کو پرامن رکھنا ممکن نہیں۔

معلوم نہیں اصحاب اقتدار کو یہ بات سمجھ کیوں نہیں آتی کہ وہ ظلم کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ظلم کا خاتمہ مزید ظلم وجبر سے نہیں کر سکتے۔ اصحابِ اقتدار ایک طرف تو علماء ومشائخ کو یہ تلقین کرتے ہیں کہ وہ پاکستانی حکومت کے خلاف کارروائیاں کرنے والے نوجوانوں کو سمجھائیں اور دوسری طرف عوام الناس کے خلاف فوج کشی برابر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اگر اصحابِ اقتدار واقعتاً پاکستان کے موجودہ مسائل کا حل چاہتے ہیں تو اس کا پائیدار حل اس کے سوا کچھ نہیں کہ:

(باقی صفحہ 85 پر)

(۱) سوات و وزیرستان میں فوجی آپریشن فی الفور بند کیا جائے اور گفت وشنید کے ذریعے صلح کی کوششیں کی جائیں۔ اب تو حکومت کے بقول سوات میں اس کی رٹ بھی قائم ہو چکی ہے‘ لہٰذا اسے سنجیدہ طور پر اس کا مظاہرہ کرنا چاہیے‘ ورنہ سوات آپریشن سے متأثر ہزاروں نوجوان انتقامی جذبے کے تحت مسلح کارروائیوں کی تحریک کا حصہ بن سکتے ہیں۔

(۲) لال مسجد کے واقعے کے ذمہ داران کو عدالتی کارروائی کے ذریعے قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۳) امریکہ کی حمایت فی الفور بند کرتے ہوئے غیر جانبدار ممالک کی پالیسی کو اختیار کیا جائے اور پاکستانی علاقوں میں ڈرون حملوں کو کسی صورت برداشت نہ کیا جائے۔

(۴) بریلوی‘ دیوبندی اور اہل حدیث علماء کو اعتماد میں لیا جائے اور ان کے ذریعے پاکستان کی جہادی تحریکوں کو پر امن نفاذ اسلام کی راہ پر گامزن کیا جائے۔

(۵) شریعت اسلامیہ کے حقیقی نفاذ کی طرف قرار واقعی پیش رفت کی جائے۔

نظر یہ آ رہا ہے کہ انتقام کی اس آگ کو اب کوئی شرعی دلیل ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ یہ آگ بھڑک اٹھی ہے اور ہمارے اپنے ہی گھر‘ ملک‘ قوم وملت کا احاطہ کر رہی ہے۔ یہ آگ پھیل رہی ہے اور بدقسمتی سے اصحابِ اقتدار آپریشن وریاستی جبر کے راستے اس آگ کو مزید ایندھن فراہم کر رہے ہیں۔ ہم نے بنگلہ دیش میں بھی بزور بازو اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا حل وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ حکومت اگر ملک وملت اور عوام کی بھلائی چاہتی ہے تو اسے اپنے ربّ کے حضور فرمانبرداری کا سجدہ کرنا ہوگا۔ اصحاب اقتدار کو اگر واقعتاً امن وامان قائم کرنا ہے تو انہیں عدل وانصاف کے سامنے جھکنا پڑے گا‘ کیونکہ بعض اوقات رفعت‘ تواضع ہی سے ملتی ہے۔ oo

اسلام کا نظامِ عدل و احسان اور برائیوں کا انسداد

سورۃ النحل کی آیت ۹۰ کی روشنی میں

پروفیسر حافظ احمد یارؒ

استاذ مکرم حافظ احمد یار صاحب مرحوم و مغفور نے یہ مقالہ وزارتِ مذہبی امور حکومتِ پاکستان کے زیر اہتمام بارہویں قومی سیرت کانفرنس منعقدہ ۱۲۔۱۳/ربیع الاول ۱۴۰۹ھ (بمطابق ۲۵۔۲۶/اکتوبر ۱۹۸۸ء) میں پیش کیا تھا۔ اس پر وزارتِ مذہبی امور کی جانب سے محترم حافظ صاحب کو قومی سطح کے اوّل مقالہ نگار کے اعزاز کا مستحق قرار دیا گیا اور طلائی تمغہ، سند امتیاز اور نقد انعام سے نوازا گیا۔ (ادارہ)

اعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم ۔ بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْیِ ۚ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ﴾ (النحل)

آیت زیبِ عنوان کے مقتضیات اور مضمرات کی تفصیل میں جانے سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بطور تعارف اس کا ترجمہ پیش کر دیا جائے:

''بے شک اللہ حکم فرماتا ہے عدل (و انصاف) کا' احسان (اور بھلائی) کا اور قرابت داروں کو دینے کا' اور منع فرماتا ہے بے حیائی سے' ناپسندیدہ (کاموں) سے' اور ظلم (و زیادتی) سے۔ وہ تم کو سمجھاتا ہے اُمید ہے کہ تم یاد رکھو گے۔''[1]

زندگی (انفرادی ہو یا اجتماعی) کی سلامتی اور کامیابی کے لیے چند بنیادی واجبات (Dos) اور ممنوعات (Donts) کا تعین کیے بغیر چارہ نہیں۔ اور ''مفرد اوامر'' (Dos & Donts) کے اس مجموعے کا حسن و کمال اس بات میں ہوتا ہے کہ وہ اختصار اور جامعیت پر مبنی ہو۔ اور اسی اختصار اور جامعیت کا

حیرت انگیز امتزاج اس آیۂ کریمہ میں نظر آتا ہے۔ کہنے کو صرف تین اوامر اور تین ہی نواہی کے عنوان بیان ہوئے ہیں۔ مگر ایک ایک عنوان اتنا جامع ہے اور زندگی کے اتنے مسائل اور اتنے گوشوں پر حاوی ہے کہ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے' اور بجا طور پر یہ آیت ایک مستقل تالیف کی محتاج ہے۔ (۲)

اور غالباً اسی لیے کتب تفسیر میں اس آیت کے بارے میں بعض اہم شخصیتوں کے تبصرے' بلکہ بعض مخالفین کے اعترافات بھی مذکور ہوئے ہیں' جو اس آیت کے موضوع کی اہمیت اور اس کے الفاظ کی جامعیت پر دلالت کرتے ہیں ـــــ اور جن کو بقول امام فخر الدین رازی اس آیت کے فضائل کہہ سکتے ہیں۔ (۳)

اس قسم کی آراء اور اقوال اگر آیت میں بیان کردہ اوامر اور نواہی کی تفصیل و تفسیر کے بعد لکھے جائیں [جیسے الطبری' الزمخشری اور الآلوسی نے کیا ہے] تو یہ ایک تبصرہ اور جائزہ کا کام دیتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو شروع میں بیان کر لیا جائے [جیسا کہ مثلاً الرازی اور المراغی نے کیا ہے] تو یہ چیز مضامین آیت کے فہم کے لیے تشویق اور ذہنی آمادگی کا باعث ہو سکتی ہے۔

اس لیے ہم ابتداءً ہی اختصار کے ساتھ اس قسم کی روایات اور واقعات میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں:

(۱) صاحب کشف الاسرار نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ خود آنحضور ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا:

> "**جماع التقوی فی القرآن ـــــ ثم تلا ھذہ الآیة ـــــ**"
>
> "کہ قرآن میں تقویٰ کے بیان پر سب سے جامع آیت ـــــ (یہ) ـــــ ہے۔ اور پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی۔" (۴)

(۲) جلیل القدر صحابی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا اس آیت کے بارے میں یہ قول ـــــ الفاظ کی معمولی کمی بیشی کے ساتھ ـــــ قریب قریب ہر مفسر نے بیان کیا ہے کہ "**اجمع آیة فی القرآن للخیر والشر ھذہ الآیة**" "یعنی قرآن کریم میں بھلائی اور برائی کے بیان میں سب سے جامع آیت یہی ہے۔ (۵)

(۳) آیت کی جامعیت کے بارے میں اس سے ملتا جلتا ایک قول امام الحسن ابن علی رضی اللہ عنہما سے بھی مروی ہے۔ (۶)

(۴) قریش کے مشہور سردار الولید بن المغیرۃ (جسے اسلام سے سخت عداوت تھی) کے بارے میں عکرمہ تابعیؒ کے حوالے سے یہ واقعہ بیان ہوا ہے کہ ایک دفعہ جب آنحضور ﷺ نے اس کے سامنے یہ آیت پڑھی تو اس نے دہرانے کو کہا۔ دوبارہ سہ بارہ سنا اور سر دھنتے ہوئے بولا: "**واللّٰہ ان لہ لحلاوۃ وان علیہ لطلاوۃ**...... الخ" (بخدا اس میں عجیب شیرینی ہے اور اس میں عجیب ترو تازگی ہے...... الخ) (۷) اگرچہ وہ مسلمان پھر بھی نہ ہوا۔

(۵) حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ قبیلہ بنو شیبان بن ثعلبہ کے سردار مقرون بن عمرو نے جب آپ ﷺ سے یہ آیت سنی تو بے اختیار کہہ اٹھا: "**دعوتَ واللّٰہ الی مکارمِ الاخلاق و محاسنِ الاعمال ولقد افک قوم کذّبوک وظاھروا علیک**" (۸) "آپ تو مکارمِ اخلاق اور محاسنِ اعمال کی

طرف دعوت دیتے ہیں۔ جن لوگوں نے آپؐ کو جھٹلایا اور آپؐ کی مخالفت پر تل گئے ہیں ان کی تو مت ماری گئی ہے)(۸)

(٦) اکثم بن صیفی (جس کا شمار عرب کے بڑے داناؤں میں ہوتا تھا) نے اپنے دو آدمی خاص طور پر آنحضورﷺ کے پاس بعض معلومات کے لیے بھیجے۔ ان آدمیوں نے یہ آیت سنی اور دہرا دہرا کر یاد کر لی۔ واپس جا کر (دوسری باتوں کے علاوہ) جب اکثم کو یہ آیت سنائی تو اس نے کہا: ''**انی لاراہ یامر بمکارم الاخلاق وینھی عن مذامّھا فکونوا فی ھذا الامر راسًا ولا تکونوا اذنابًا**'' (میں دیکھتا ہوں کہ وہ (پیغمبرؐ) تمام عمدہ اور اعلیٰ اخلاق کا حکم دیتا ہے اور تمام کمینہ اور گھٹیا اخلاق و اعمال سے روکتا ہے۔ اور پھر اپنے لوگوں سے کہا تم اس سلسلہ میں سر بنو اور دُم نہ بنو۔ یعنی تم اس کے ماننے میں جلدی کرو پیچھے نہ رہ جاؤ)۔(۹) چنانچہ وہ اپنے سو آدمیوں کے ساتھ قبولِ اسلام کے لیے مدینہ روانہ ہوا مگر راستے میں فوت ہو گیا۔ اس کے ساتھیوں نے مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کیا اور یہ واقعہ سنایا تو اسی کے بارے میں آیت:
﴿**وَمَنْ یَّخْرُجْ مِنْ بَیْتِہٖ مُھَاجِرًا اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ یُدْرِکْہُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ**﴾
(النساء:۱۰۰) نازل ہوئی تھی۔(۱۰)

(۷) مشہور صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ اصحابِ سیر اور مفسرین نے بیان کیا ہے کہ کس طرح یہی آیت ان کے دل میں ایمان کے اترنے اور آنحضرتﷺ کی محبت پیدا کرنے کا سبب بنی۔ وہ محاسنِ اخلاق کے دلدادہ تھے اور اس آیت کی تعلیم نے ان کو بہت متاثر کیا۔ البتہ کتابوں میں واقعہ کی تفصیلات مختلف طرح سے بیان ہوئی ہیں۔(۱۱)

(۸) قتادہ تابعیؒ کا ایک طویل قول بھی بہت سے مفسرین نے بیان کیا ہے' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام اخلاقی محاسن کا حکم دیا ہے جسے عرب جاہلیت میں بھی محاسن شمار کرتے تھے اور ان تمام رذائل سے منع کیا ہے جن کو جاہلیت میں بھی مذموم سمجھا جاتا تھا۔(۱۲)

مندرجہ بالا روایات میں یہ جو ''اخلاقی حس'' کو اپیل کرنے والی بات ہوئی ہے اس سے ایک تو اس آیت کی تعلیمات کی آفاقیت اور عالمگیریت کا پتہ چلتا ہے۔ دوسرے یہ کہ عربِ جاہلیت میں ساری خرابیوں کے باوجود مکارمِ اخلاق کی عظمت اور محبت موجود تھی۔ اس موضوع پر کتبِ سیرت کے مؤلفین نے: ''حضورﷺ کی بعثت عرب میں کیوں ہوئی؟'' کے عنوان سے بات کی ہے۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا مقصود ہے کہ ابتدائی مسلمانوں میں سے بیشتر زمانۂ جاہلیت میں بھی مکارمِ اخلاق سے مزین تھے۔ فی الواقع مکارمِ اخلاق (جو آیت زیبِ عنوان کا موضوع ہے) نبوت سے اکتسابِ فیض کی شرط بھی ہیں اور علامت بھی۔

(۹) خلیفۂ راشد حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے خطبۂ جمعہ کے آخر میں بالالتزام اس آیتِ مبارکہ کے

پڑھے جانے کا حکم دیا تھا۔ اس زمانے سے آج تک یہ آیت دنیائے اسلام کے ہر حصے میں خطبہ جمعہ کے ایک جزء کی حیثیت سے پڑھنے کا رواج چلا آتا ہے' اور دنیا میں لاکھوں بلکہ کروڑوں مسلمان کم از کم ہفتہ میں ایک دفعہ (بروزِ جمعہ) مسجد کے منبر سے یہ آیت سنتے ہیں۔ مگر اس کے معانی سے آگاہی حاصل کرنے اور اپنے کردار کو اس آیت کے آئینے میں دیکھنے —— بلکہ ایک طرح سے اس ہفتہ وار ''یاد دہانی'' کے باوجود اپنی پڑتال آپ یعنی محاسبۂ نفس کرنے —— پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی ع

رہ گئی رسمِ اذاں رُوحِ بلالی نہ رہی!

حکومت پاکستان نے سیرتِ طیبہ کی مناسبت سے اور ((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَكَارِمَ الْاَخْلَاقِ)) کی رعایت سے اس آیت مبارکہ کو بطور موضوع منتخب کر کے ایک اچھی مثال قائم کی ہے۔ خدا کرے یہ مقالاتِ سیرت قوم کے اندر اس آیت کی روح کو سمجھنے اور اس پر عمل پیرا ہونے کے محرک ثابت ہوں۔

اس تمہید اور تعارفِ آیت کے بعد اب ہم ذیل میں اس آیہ کریمہ میں بیان کردہ اوامر ونواہی کے معانی اور مفاہیم کے بارے میں اہل علم کے اقوال وآراء کا خلاصہ پیش کرتے ہیں:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآئِ ذِى الْقُرْبٰى﴾

آیت کی ترتیب کے مطابق پہلے ہم ان تین اوامر یا واجبات کی بات کرتے ہیں۔ یعنی عدل' احسان اور ایتاءِ ذی القربیٰ کی۔

(۱) العدل:

عدل کے بنیادی لغوی معنی برابری اور مساوات کے ہیں اور ان معنوں کے لحاظ سے ہی قرآن میں آیا ہے:

﴿وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ◆﴾ (الانعام)

''وہ اپنے پروردگار کے برابر ٹھہراتے ہیں یعنی شرک کرتے ہیں۔''

اسی طرح:

﴿اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا﴾ (المائدۃ:۹۵)

''یا اس کے برابر یا اس کے عوض روزے رکھنا''۔ وغیرہ۔

ان بنیادی معنوں کو سامنے رکھتے ہوئے مفسرین نے عدل کی تعریف اس طرح کی ہے:

(۱) هو التوسط بين طرفي النقيض . وهو ضد الجور [۱۳]

''دو مخالف انتہاؤں کے درمیان ٹھیک یعنی یکساں فاصلے پر ہونا۔ اور اس کی ضد ''جور'' ہے' جس کے معنی ہیں ایک طرف مڑ جانا''۔

(۲) هو مراعاة التوسط بين طرفي الافراط والتفريط . وهو رأس الفضائل [۱۴]

''افراط وتفریط (انتہائی کمی اور انتہائی بیشی) کے درمیان (رہنے کا) خیال رکھنا' اور یہ چیز (عدل)

تمام فضائل کی ''جڑ'' ہے''۔

(۳) **هو التوسط والتسوية فى الحقوق فيما بينكم وترك الظلم وايصال كل ذى حق حقه**[۱۵]

''یعنی باہمی حقوق میں ٹھیک ٹھیک انصاف اور برابری ملحوظ رکھنا اور ہر حق دار کو اس کا حق پہنچانا اور ظلم نہ کرنا''۔

(۴) **هو ايتاء حقوق الخلق كلهم**[۱۶]

''یعنی تمام مخلوق کے حقوق بے لاگ طریقے سے دینا''۔

(۵) **الانصاف بين الخلق والتعامل بالاعتدال الذى ليس فيه ميل ولا عوج**[۱۷]

''مخلوق میں انصاف کرنا اور ایسے اعتدال وتوازن کے ساتھ معاملہ کرنا جس میں کسی قسم کا جھکاؤ یا کجی اور ٹیڑھ نہ ہو''۔

(۶) **هو ان يُنصف وينتصف**[۱۸]

''(عدل) یہ ہے کہ انصاف دے بھی اور انصاف لے بھی۔ یعنی نہ کسی پر ظلم کرے نہ اپنے اوپر ظلم ہونے دے''۔

(۶) **هو ايصال الحق الى مستحقه وهو وضع الشىء فى محله وهو ميزان الله فى الارض**[۱۹]

''حق کو حق دار تک پہنچانا اور ہر چیز کو ٹھیک اس کی جگہ پر رکھنا اور یہ (عدل) زمین میں گویا اللہ کی ترازو ہے''۔

یوں تو لفظ ''عدل'' اردو میں بھی متعارف ہے' تاہم عموماً اس کا ترجمہ ''انصاف'' یا ''اعتدال'' کیا جاتا ہے' اور دونوں میں قدرِ مشترک افراط وتفریط سے بچنا اور ٹھیک درمیانی راہ اختیار کرنا ہے۔ خیال رہے کہ لفظ انصاف اردو میں ''تنصیف'' (نصف نصف کر لینا) کے معنوں میں استعمال نہیں ہوتا بلکہ یہ انگریزی لفظ (Justice) کے ہم معنی سمجھا جاتا ہے۔

عدل بمعنی انصاف کرنا کی ایک صورت تو یہ ہے کہ جو تمہارے ساتھ نیکی کرے اس کے ساتھ اتنی نیکی ضرور کرو جو اس سے کم نہ ہو' اور جو تم سے برائی کرے اس کے ساتھ صرف اتنی ہی ''برائی'' کر لو' اس سے زیادہ مت بڑھو۔ یعنی نیکی کرنے والے کے ساتھ ویسی ہی نیکی کرنا اور برائی کرنے والے کے ساتھ ویسی ہی برائی کرنا۔ یہ بھی عدل ہے اور حلال ہے۔[۲۰] بحوائے آیہ: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثۡلُهَا﴾ (الشوریٰ:۴۰) یعنی برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی (جائز) ہے۔ اور یہی مضمون [البقرۃ:۱۹۴' النحل:۱۲۶ اور الشوریٰ:۴۱ میں بھی ہے] تاہم فضیلت ''احسان'' کی ہے جس کا ذکر ابھی آگے آئے گا۔

اور عدل وانصاف کا تقاضا یہ بھی ہے کہ کسی سے برائی نہ کی جائے' نہ قولی' نہ فعلی' نہ ظاہری' نہ باطنی۔ ہر شخص کو اس کے حقوق پوری دیانت داری کے ساتھ ادا کیے جائیں۔ انصاف ایک طرح سے پوری

انسانیت کی امانت ہے جسے بلاتمیز واستثناء ہر ایک حق دار تک پہنچانا چاہیے۔

قرآن کریم میں عدل کی بلند ترین صورت کو ''قسط'' بھی کہا گیا ہے' جس کا اردو ترجمہ ''ٹھیک ٹھیک انصاف کرنا'' کیا جا سکتا ہے۔ اور اس ''ٹھیک ٹھیک انصاف'' کرنے والوں (مُقسطین) کا اللہ کے محبوب بندے ہونے کا ذکر قرآن کریم میں ایک سے زیادہ جگہ آیا ہے' یعنی ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ﴾ (المائدۃ:٤٥' الحجرات:٩ اور الممتحنۃ:٨)۔ اس کے علاوہ قرآن کریم عدل اور قسط کی طرف کئی طریقوں سے توجہ دلاتا ہے۔ مثلاً:

(۱) کہیں تو بصیغۂ امر حکم دیا گیا ہے' جو وجوب کا مقتضی ہوتا ہے۔ جیسے ﴿وَاَقْسِطُوْا﴾ (الحجرات:٩) ''قسط سے کام لو'' اور ﴿اِعْدِلُوْا﴾ (المائدۃ:٨) یعنی ''عدل سے کام لو''۔ اور ﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾ (الانعام:١٥٢) کہ بولنے میں بھی عدل سے کام لو۔

(۲) بعض جگہ ''کہیں بے انصافی نہ کر بیٹھو'' کی صورت میں خطرے سے آگاہ کیا گیا ہے' جیسے: ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا﴾ (النساء:١٣٥) ''خواہشات کے پیچھے مت لگو کہیں عدل سے نہ ہٹ جاؤ'' اور ﴿لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا﴾ (المائدۃ:٨) ''کسی گروہ کی رنجش تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرنے پائے''۔

(۳) اور کہیں لوگوں کے درمیان فیصلہ کرتے وقت عدل اور قسط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنے کا دوٹوک حکم دیا گیا ہے۔ جیسے: ﴿وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ﴾ (النساء:٥٨) ''اور جب لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرو'' اور ﴿وَاِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدۃ:٤٢) ''کہ جب تو فیصلہ دے تو ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ فیصلہ دے'' وغیرہ۔

اسلامی حکومت میں عدلیہ کی بنیاد اور اس کے اختیارات اسی ''انصاف کے سامنے سب برابر'' کے اصول پر مبنی ہونے چاہئیں۔ کتبِ حدیث میں عادل حاکم اور قاضی (جج) کی تعریف اور اس کے اجر کے متعلق' اور اس کے مقابلے پر ظالم اور جابر حاکم اور خائن و بے انصاف قاضی (جج) کی مذمت اور اس کی اُخروی سزا کے بارے میں مستقل ابواب ہیں' جن کی تفصیل کے لیے کئی صفحات درکار ہوں گے۔

اور ''عدالتی معاملات'' کے علاوہ بھی کسی شخص یا اشخاص کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے وقت' کوئی رائے دیتے وقت بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔

مسلمانوں کے دو متخاصم اور برسر پیکار گروہوں میں اوّل تو صلح کرانے کا' ورنہ اہل حق کا ساتھ دے کر دوسرے فریق کو صلح پر مجبور کر دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور اب اس ''مجبوری'' کی صلح میں بھی پائیدار صلح اور دیرپا امن کی خاطر اس صلح کا عدل وقسط پر مبنی ہونا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ یہ پورا مضمون سورۃ الحجرات کی آیت ۹ میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ اور اس میں آخر پر کہا گیا ہے: ﴿فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ

وَاَقْسِطُوْاؕ﴾ یعنی ”ان کے درمیان صلح کراؤ عدل وقسط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے“۔

قرآن کریم نے جہاں عدل قائم کرنے اور عدل سے کام لینے کے احکام دیے ہیں وہاں ان مقامات کی بھی نشان دہی کر دی ہے جہاں عدل اور قسط سے انحراف کے محرکات یا امکانات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً:

(۱) یہ کہ عدل وقسط کے معاملات میں اپنے ذاتی مفادات، یا اپنے عزیزوں (والدین اور اقارب) کے مفادات یا امیری غریبی کے طبقاتی جذبات کو آڑے نہ آنے دو۔ یہی مضمون اس آیت میں بیان ہوا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ شُھَدَآءَ لِلّٰہِ وَلَوْ عَلٰٓی اَنْفُسِکُمْ اَوِ الْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ ج اِنْ یَّکُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا فَاللّٰہُ اَوْلٰی بِھِمَا قف فَلَا تَتَّبِعُوا الْھَوٰٓی اَنْ تَعْدِلُوْا ج وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ﴿۱۳۵﴾﴾ (النساء)

ہم بخوفِ طوالت اس کا ترجمہ چھوڑ رہے ہیں، ویسے اس کا نفس مضمون اوپر بیان ہو چکا ہے۔

(۲) اور شاید اس قسم کے مفادات کو بھی آدمی انصاف کی خاطر نظر انداز کر لے۔ مگر اس سے بھی مشکل مرحلہ یہ ہے کہ آدمی کو جس سے کوئی رنجش یا دشمنی ہو اس کے بارے میں بھی عدل وانصاف کے تقاضوں سے غافل نہ ہو۔ اس کے لیے قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے:

﴿...... وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا قف ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی ز وَاتَّقُوا اللّٰہَ ط اِنَّ اللّٰہَ خَبِیْرٌ م بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۸﴾﴾ (المائدۃ)

”کسی گروہ کی دشمنی تم کو بے انصافی پر آمادہ نہ کرے۔ انصاف کرو، یہ تقویٰ سے قریب تر ہے، اور اللہ سے ڈرو، اُسے تمہارے اعمال کی خبر ہے“۔

اور اگر عدل بمعنی ”اعتدال پر قائم ہونا“ کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اسلام کے تمام عقائد اور احکام اعتدال اور توازن کی بہترین مثال پیش کرتے ہیں۔ مثلاً عقائد میں عقیدۂ توحید ”انکارِ خدا“ اور ”شرک“ (کئی خدا بنانا) کی افراط اور تفریط کے درمیان ایک نقطۂ عدل ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ بعض مفسرین نے اس آیت (النحل: ۹۰) میں عدل سے مراد ہی توحید لی ہے۔ (۲۱)

اعمال اور تکالیف (احکامِ شریعت) میں بھی یہی اصولِ اعتدال کارفرما نظر آتا ہے۔ روح اور جسم میں سے کسی کی ضروریات کو نظر انداز نہیں کیا گیا، بلکہ ہر معاملے میں ”رعایة العدل والوسط“ کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسلام میں نہ مطلقاً اباحت ہے اور نہ منع طیبات ہے۔ دُنیاوی خواہشات اور جسمانی لذائذ میں غرق ہونے سے روکا گیا ہے، مگر دُنیا بالکل ترک کرنے (رہبانیت) کا حکم بھی نہیں دیا گیا۔ اقتصادیات میں فضول خرچی اور بخل کے درمیان راہِ اعتدال اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ [یہ مضمون سورۃ الاسراء: ۲۹ اور الفرقان: ۶۷ میں تفصیل سے بیان کیا ہوا ہے، مگر بخوفِ طوالت اس کی طرف صرف اسی اشارہ پر اکتفا کرتے ہیں۔]

اور یہی وہ توازن واعتدال کی راہ ہے جس کی بنا پر اُمتِ مسلمہ کو ''اُمتِ وسط'' کہا گیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا﴾(البقرۃ:۱۴۳)

اللہ کے قانون تشریعی کی مانند اللہ کا قانونِ تکوینی بھی عدل واعتدال پر مبنی ہے۔ اسی لیے بعض اہل علم نے کہا ہے کہ ''بالعدل قامت السمٰوات والارض''[۲۲] کہ کائنات عدل کی بنا پر قائم ہے۔ کائنات کے طبیعی قوانین میں توازن واعتدال پر سائنس دانوں کے انکشافات اور اعترافات کوئی ڈھکی چھپی چیز نہیں رہے۔ اور غالباً ﴿وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ﴾(الرحمٰن) میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

اور جس طرح یہ کائنات (عالم تکوینی) ایک نظامِ عدل واعتدال اور تناسب وتوازن پر قائم ہے اسی طرح انسانی معاشرے میں اسلام کا تشریعی نظامِ عدل برپا کرنا ضروری ہے۔ اس کے بغیر معاشرے کی بیماریاں اور خرابیاں ختم نہیں ہوسکتیں بلکہ اس کا وجود ہی خطرے میں پڑ جاتا ہے' اور کاروبارِ حکومت تو عدل کے بغیر چل ہی نہیں سکتا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مشہور قول ہے کہ ''کفر وشرک کے ساتھ حکومت برقرار رکھنا ممکن ہے مگر عدل کے بغیر ایسا نہیں ہوسکتا''۔ بلکہ علامہ طنطاوی (جوہری) نے تو افلاطون کی ''جمہوریہ'' کے حوالے سے یہ لطیفہ بھی بیان کیا ہے کہ ''باہمی عدل وانصاف'' کے بغیر تو چوروں کا ایک جتھا بھی نہیں چل سکتا' تو اقوام واُمم اور اجتماع ومعاشرہ کا کیا حال ہے؟[۲۳]

پس اس آیۂ مبارکہ کی روشنی میں مسلم معاشروں کے اندر عدلِ اجتماعی کا ایک ایسا نظام نافذ کرنا ضروری ہے جس میں ہر فرد کے لیے حصولِ انصاف' حصولِ تعلیم اور حصولِ معاش کے یکساں مواقع میسر ہوں اور جس میں ہر قسم کے استحصال کے امکانات کا راستہ مسدود کر دیا جائے۔ اس لیے کہ عدل ہی حکومت کی بنیاد' معاشرے کی روح اور تہذیب وتمدن کی جان ہے۔[۲۴]

انسانی شخصیت کا حسن وکمال ہو یا انسانی معاشرے کا شرف واستحکام سب اسی قانونِ عدل اور توازن واعتدال کے ساتھ وابستہ ہیں۔

(۲) الاحسان:

یہ دوسرا ضروری حکم ہے جو آیت میں دیا گیا ہے۔

لفظ احسان باب افعال کا مصدر ہے جو متعدی بنفسہٖ بھی استعمال ہوتا ہے اور متعدی بصلہ [''با'' (بِ) یا ''اِلٰی'' کے ساتھ] بھی۔ عربی افعال اور خصوصاً مصادر میں یہ قاعدہ ہے کہ جب وہ بغیر ''صلہ'' کے آ رہے ہوں تو ان میں دونوں معنی [صلہ کے ساتھ والے اور صلہ کے بغیر والے] کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔ مثلاً:

(۱) ''احسان'' بغیر صلہ کے ''اتقان'' کے معنوں میں آتا ہے' یعنی ''کوئی کام خوب اچھی طرح اور حسن وخوبی کے ساتھ کرنا''۔ قرآن کریم میں یہ فعل ان معنوں میں کئی جگہ آیا ہے' مثلاً: ﴿اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ﴾(السجدۃ:۷)' ﴿اِنَّهٗ رَبِّيْٓ اَحْسَنَ مَثْوَايَ﴾(یوسف:۲۳)' ﴿اِتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ﴾(التوبۃ:۱۰۰)'

﴿وَاَدَاءٌ اِلَيۡهِ بِاِحۡسَانٍ﴾اور﴿تَسۡرِيۡحٌۢ بِاِحۡسَانٍ﴾(البقرة:۱۷۸'۲۲۹) وغیرہ۔ان سب مقامات پر لفظ احسان ''عمدہ طریقے پر''۔''اچھی طرح سے'' کے معنوں میں ہی آیا ہے ——اور

(۲) جب یہ فعل ''احسان''''با''(بِ) یا ''اِلٰی'' کے صلہ کے ساتھ آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''حسن سلوک کے ساتھ پیش آنا اور کسی کے ساتھ بھلائی کرنا''۔اس طرح اس میں عدل سے بڑھ کر ''ایثار'' کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔اور ان ہی معنوں میں ''والدین'' کے ساتھ ''احسان'' کا حکم قرآن کریم میں پانچ جگہ آیا ہے:[البقرة:۸۳'النساء:۳۶'الانعام:۱۵۱'الاسراء:۲۳اور الاحقاف:۱۵ ——اسلوب اور الفاظ کا فرق ہے مگر مفہوم ہر جگہ پر ایک ہی ہے۔] بلکہ سورۃ النساء کی آیت ۳۶ میں تو والدین کے ساتھ دوسرے قرابت داروں' یتیموں' مسکینوں' پڑوسیوں' مسافروں' ساتھیوں اور ماتحتوں کو بھی اس حکم احسان میں شامل کر لیا گیا ہے۔پوری آیت یوں ہے:

﴿وَاعۡبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشۡرِكُوۡا بِهٖ شَيۡـئًا وَّبِالۡوَالِدَيۡنِ اِحۡسَانًا وَّبِذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡيَتٰمٰى وَالۡمَسٰكِيۡنِ وَالۡجَارِ ذِى الۡقُرۡبٰى وَالۡجَارِ الۡجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالۡجَنۡۢبِ وَابۡنِ السَّبِيۡلِ ۙ وَمَا مَلَـكَتۡ اَيۡمَانُكُمۡ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنۡ كَانَ مُخۡتَالًا فَخُوۡرَا ۙ﴾

اہل علم نے آیۂ زیر مطالعہ میں لفظ ''احسان'' کے ان دونوں معنوں کو ملحوظ رکھا ہے۔ہم دونوں کا الگ الگ بیان کرتے ہیں۔(یعنی احسان بمعنی اتقان۔اور احسان بمعنی معروف)

(۱) احسان بمعنی اتقان[کسی کام کو بحسن وخوبی سرانجام دینا] کے لحاظ سے احسان کی وضاحت یوں کی گئی ہے:

(i) **الاحسان هو احسان الاعمال والعبادة والاتيان على الوجه اللائق**[۲۵]

یعنی ''اعمال وعبادات بطریق احسن سرانجام دینا۔محض خانہ پری پر اکتفاء نہ کرنا۔''

(ii) **الاحسان هو اداء الفرائض اعتبارا متعديا بنفسه**[۲۶]

''متعدی بنفسہ فعل سمجھتے ہوئے احسان کا مطلب اداء فرائض (بطریق احسن) ہے''۔

اور اسی بنا پر امام رازی نے احسان سے مراد ''الاخلاص فی التوحید'' یعنی خالص اور ستھری توحید مراد لی ہے۔[۲۷] اور حدیث جبریلؑ کے الفاظ((اَنۡ تَعۡبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنۡ لَمۡ تَكُنۡ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ[۲۸])) [(یعنی احسان یہ ہے) کہ تو اللہ کی عبادت یوں کرے گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔ورنہ یہ تو سمجھو کہ وہ تم کو دیکھ رہا ہے] کو بھی انہوں نے احسان کے ان ہی معنوں پر محمول کیا ہے۔یعنی ''بلحاظِ کیفیت وکمیت کمالِ حسن عبادت''۔**الاستغراق فی شهود مقامات العبودية والربوبية**[۲۹] اور ابن العربی نے ان ہی معنوں کی وضاحت یوں کی ہے:''**مشاهدة الحقّ فى كل حال. واليقين بانه يراك فليس من الادب ان تعصىَ مولاك بحيث يراك**''[۳۰] یعنی ''ہر حال میں حق کو نگاہ کے سامنے رکھے اور یقین ہو کہ مالک دیکھ رہا ہے تو پھر اس کے دیکھتے ہوئے کوئی نافرمانی کرنا تو شدید بے ادبی ہے''۔اور اسی معنی کے لحاظ سے کہ

جس عمل میں اتقان واحسان نہیں وہ عمل حسن نہیں ہے [**من لم یُحسن ولم یُتقن عملَه فلیسَ عملُه حسنا**] ——— کی بنا پر بعض اہلِ علم نے بجا طور پر یہ کہا ہے کہ اس احسان (اپنے عمل میں خوبی پیدا کرنا) کا دائرہ پوری زندگی اور ہر شعبۂ حیات کو محیط ہے۔ لہٰذا **احسان فی العبادات والطاعات** اور **احسان فی المعاملات** کی طرح مسلمان کے لیے **احسان فی الصناعات** بھی اس میں شامل ہے۔ (۳۱)

یہ حکم احسان مسلمانوں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی صنعت وحرفت' انڈسٹری اور ٹیکنالوجی میں بھی معیار کی بلندی (quality) پر زور دیں۔ اپنی تعلیم گاہوں کو ٹھوس بنیادوں پر کھڑا کریں اور تعلیم کو صحیح معنوں میں لیاقت پیدا کرنے کا ذریعہ بنایا جائے۔ دفتری نظام کو مثالی بنایا جائے' وغیرہ۔ الغرض ہر کام میں efficiency اور حسن کارکردگی یقیناً اس آیۂ کریمہ کے حکم میں داخل ہے۔

(**۲**) اور احسان جب متعدی بصلہ ہو تو اس کے معنی کی وضاحت یوں کی گئی ہے: (i) ''نکوئی درحق دیگراں و رفاہِ مردم'' یعنی ''دوسروں کے حق میں بھلائی اور انسانوں کی بہبود''۔ (ii) **ھو التفضل بان یقابل الخیر باکثر منه والشر بان یعفو عنه** (iii) **ھو ان یُنصف ولا ینتصف** (۳۴) یعنی انصاف دے مگر انصاف لے نہیں۔ یعنی دوسرے کو پورا پورا حق دے مگر خود اپنے حق سے کم تر پر راضی ہو جائے۔ (iv) احسان یہ ہے کہ جس نے تمہارے ساتھ نیکی کی اس کے ساتھ اس سے بڑھ کر نیکی کرو اور جس نے تمہارے ساتھ برائی کی اس کے ساتھ بھی نیکی کرو۔ (۳۵)

احسان میں فیاضانہ برتاؤ' رواداری اور عالی ظرفی کے عناصر بھی شامل ہیں اور یہ عدل سے اونچا درجہ ہے اور اس کی اہمیت بھی اجتماعی زندگی میں عدل سے زیادہ ہے۔ (بقول مودودی صاحبؒ ''عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا حسن اور کمال ہے۔ اور عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے''۔ (۳۶) جہاں اللہ تعالیٰ نے عدل (بمعنی ''برابر کی برائی'') کی اجازت دی ہے وہاں احسان کی تعریف کی ہے' مثلاً: ﴿**فَمَنۡ عَفَا وَاَصۡلَحَ فَاَجۡرُهٗ عَلَى اللّٰهِ**ؕ﴾ (الشوریٰ: ۴۰) اور ﴿**وَلَمَنۡ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ**﴾ (الشوریٰ) اور ﴿**اِدۡفَعۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ السَّیِّئَةَ**﴾ (المؤمنون: ۹۷) اور ایک حدیث میں یہ قول حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کیا گیا ہے کہ "**الاحسان ان تحسن الی من اساء ک ولیس الاحسان ان تحسن الی من احسن الیک**" (۳۷) یعنی ''احسان تو یہ ہے کہ برا سلوک کرنے والے کے ساتھ نیکی کرو۔ اچھے سلوک کا اچھا بدلہ تو کوئی احسان نہ ہوا''۔ یہ چیز مراتب احسان میں سے سب سے اونچا درجہ ہے۔ اور شاید اسی لیے امام فخر الدین رازی نے کہا ہے کہ احسان میں ''**التعظیم لامر اللّٰه**'' اور ''**الشفقة علی خلق اللّٰه**'' دونوں ہی شامل ہیں۔ (۳۸)

اور ان ہر دو معنی [کام حسن وخوبی سے کرنا اور کسی سے حسن سلوک کرنا] کے لحاظ سے قرآن کریم میں

نہ صرف احسان کا حکم دیا گیا ہے بلکہ مختلف طریقوں سے اس کی فضیلت بیان کر کے اس کی ترغیب دلائی گئی ہے۔ مثلاً: (۱) ﴿سَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرۃ:۵۸ اور الاعراف:۱۶۱) ''ہم احسان کرنے والوں کو زیادہ دیں گے۔'' (۲) ﴿اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (الاعراف) ''اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے۔'' (۳) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (التوبۃ:۱۲۰' ھود:۱۱۵ اور یوسف:۹۰) ''یقیناً اللہ احسان کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں ہونے دے گا۔'' (۴) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (العنکبوت) ''کہ محسنین کو اللہ کی معیت حاصل ہو گی۔'' (۵) اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران:۱۳۴'۱۴۵' البقرۃ:۱۹۵' المائدۃ:۱۳'۹۵) یعنی ''بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو بہت پسند کرتا ہے۔''

الغرض حسن عمل' حسن کارکردگی' خدمت خلق' نفع رسانی' رفاہِ عامہ اور معاشرتی بہبود کا کوئی مثبت تصور اور عمل ایسا نہیں ہے جو اس لفظ ''احسان'' کے معنی میں شامل نہ ہو اور بجا طور پر احسان کو ''جامعٌ لکل خیر'' [۳۹] ''سب بھلائیوں کا جامع'' کہا گیا ہے' بلکہ قرآن کریم نے اس آیت (النحل:۹۰) کے ذریعے احسان کی تمام قسموں کو مامور بہ کر کے ان کو عبادت کا درجہ دے دیا ہے۔ کیونکہ مسلمان ''الشفقة علی خلق اللّٰه'' کا ہر کام ''التعظیم لامر اللّٰه'' کے جذبے اور نیت سے کرتا ہے' یا ایسا ہی کرنا چاہیے۔

(۳) ایتاء ذی القربیٰ

یہ تیسرا حکم ہے جس کی پابندی اس آیت (النحل:۹۰) کی رو سے لازمی ہے۔ ایتاء ذی القربیٰ کے لفظی معنی ہیں: ''قرابت والوں کو دینا''۔ مفسرین عموماً اس کے دو مفہوم بیان کرتے ہیں اور دونوں ہی اپنی اپنی جگہ درست ہیں' ان میں کوئی تضاد نہیں ہے۔

پہلا مفہوم ہے قرابت داروں کو ان کا حق دینا:

(۱) **اعطاء ذی القربی الحق الذی اوجبه اللّٰه علیک** [۴۰]

یعنی ''قرابت داروں کو وہ حق دینا جو اللہ تعالیٰ نے تجھ پر واجب ٹھہرایا ہے''۔

(۲) **ھو اعطاء الاقارب حقھم** [۴۱]

یعنی ''رشتہ داروں کو ان کا حق دینا''۔

اور ان معنوں کی تائید قرآن کریم کی دو آیتوں سے ہوتی ہے' جن کے الفاظ قریباً یکساں ہیں: (۱) ﴿وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (الاسراء:۲۶) اور (۲) ﴿فَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ﴾ (الروم:۳۸) یعنی قرابت دار کو اس کا حق دو۔ اور اس لیے بھی کہ فعل ''ایتاء'' قرآن کریم میں صرف ''دینا'' سے زیادہ ''ادا کرنا'' کے معنی میں استعمال ہوا ہے' مثلاً: ﴿اٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ یعنی زکوٰۃ ادا کرو۔ گویا یہ ادائے واجب ہے' عدل ہے' کوئی احسان نہیں ہے۔

دوسرا مفہوم: ایتاءذی القربی کے دوسرے معنی ہیں رشتہ داروں کی مالی (یا دیگر) امداد کرنا۔

هو اعطاء الاقارب ما يحتاجون اليه (۴۲)

''قرابت والوں کی ضرورت کے مطابق مدد کرنا''۔

یعنی قرابت والوں کے صرف قانونی حق ہی نہیں بلکہ جملہ اخلاقی' معاشرتی اور تمدنی حقوق ادا کرنا احسان ہے —— اوران معنوں کی تائید احسان کے بارے میں قرآنی آیات کے عموم کے علاوہ ان متعدد احادیث نبویہ سے ہوتی ہے جن میں صلہ رحمی پر زور دیا گیا [اور جن کے لیے کتب حدیث میں عموماً ایک مستقل ''باب البرّ والصّلة'' مختص ہوتا ہے اور جن کی تفصیل یہاں بخوفِ طوالت ممکن نہیں ہے۔]

اور غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں مفہوم و معنی کے لحاظ سے ''اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی'' کا حکم تو ''عدل'' اور ''احسان'' میں بھی شامل ہے۔آیت میں اس کا الگ حکم اس پر خصوصی توجہ دلانے کے لیے دیا گیا ہے۔ ''**وَخَصَّ ذی القربی لانّ حقوقهم اوكد وصلتهم اوجب**'' (۴۳) یعنی قرابت داروں کی تخصیص اس لیے کی ہے کہ ان کے حقوق کی زیادہ تاکید ہے اوران سے صلہ رحمی زیادہ لازمی ہے۔

اپنے پہلے مفہوم (یعنی اداءِ واجب اور اداءِ حق) کے لحاظ سے یہ حکم ''ایتاء'' اس لیے خصوصاً قابل توجہ ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اجتماعی زندگی میں جھگڑوں' حق تلفیوں اور زیادتیوں کا آغاز اکثر قریبی رشتہ داروں کے درمیان ہوتا ہے۔ سگے بھائی بہنوں کے جائیداد کے جھگڑے کوئی غیر معروف بات نہیں ہیں۔قرابت داروں کے معاملے میں عدل وانصاف سے کام لینا زیادہ توجہ طلب ہے۔اس لیے کہ یہاں احسان تو کجا عدل وانصاف سے بھی انحراف کے امکانات اور مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔

اور اپنے دوسرے مفہوم (یعنی رشتہ داروں کی امداد) کے لحاظ سے یہ حکم ''ایتاء'' اس لیے اہم ہے کہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ آدمی اپنے قرابت داروں میں سے مستحق اور ضرورت مند لوگوں کا تعین بہتر اور یقینی طریقے سے کرسکتا ہے' کیونکہ وہ سب کے حالات سے اچھی طرح آگاہ ہوتا ہے۔اور یہ حکم اس لیے بھی اہم ہے کہ خاندان اور برادری کے پہلو سے مساوات کی بنا پر بعض دفعہ ایک غریب آدمی اپنے امیر رشتہ دار کے معاشرتی اور معاشی امتیاز کو ہیچ سمجھتا ہے اور اس سے مالی امداد طلب کرنا بلکہ قبول کرنا بھی اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھتا اور اس میں اپنی ہتک محسوس کرتا ہے۔ایسے مستحق اور مُتَعَفِّف افراد کی امداد کرنا جو امداد کے لیے سوال نہیں کرتے بہت نازک اور دشوار کام بھی ہے مگر بہت بڑی نیکی بھی ہے۔[سورة البقرة:۲۷۳ میں یہی مضمون وضاحت سے بیان ہوا ہے۔] اور اسی لیے اسلام میں سب سے پہلے قریبی رشتہ داروں اور پھر پڑوسیوں کے ساتھ بھلائی کا حکم دیا گیا ہے [تفصیل کے لیے سورة النساء:۳۶ دیکھئے جو اسی مقالے میں اوپر بیان ہو چکی ہے]۔معاشرے میں احسان اور نفع رسانی کے فروغ کا فطری طریقہ ہی یہی ہے۔

اور خیال رہے کہ کسی بھی مفہوم کے لحاظ سے ''اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی '' کے حکم کا تعلق محسوبیت یعنی خویش پروری اور اقربا نوازی (Nepotism) کے ساتھ نہیں ہے' کیونکہ اس میں آدمی اپنے رشتہ دار کو اس کا کوئی حق نہیں دے رہا ہوتا' بلکہ کسی دوسرے کا حق چھین کر اسے دے دیتا ہے' اور یہ تو سیدھا ''منکر'' اور ''بغی'' ہے [جس کے قطعی حرام ہونے کا ذکر اسی آیت زیر مطالعہ کے اگلے حصے میں آ رہا ہے۔]

یہاں مقالہ نگار بطور خاص حکومت پاکستان کی توجہ اس طرف دلانا اپنا فرض سمجھتا ہے کہ ہمارا ایک ملکی قانون ''اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی '' کے اس قرآنی حکم کی خلاف ورزی کا باعث بن رہا ہے' اور وہ یہ ہے کہ زرعی ملکیت میں ایک خاص رقبہ (غالباً چھ ایکڑ) سے آگے مزید تقسیم کی ممانعت ہے۔ معاشی نقطۂ نظر سے یہ قانون یقیناً مفید ہے' مگر چونکہ اس کے ساتھ فقہ اسلامی کا مسلمہ اصول تخارج شامل نہیں کیا گیا' اس کی وجہ سے بے شمار زور آور کھاتہ دار اپنے کمزور رشتہ داروں کی حق تلفی کرتے ہیں اور کمزور کے پاس اس کا کوئی مداوا نہیں' کیونکہ نہ تو وہ اپنا حصہ علیحدہ تقسیم کرا سکتا ہے اور نہ اسے الگ فروخت کر سکتا ہے۔ اگر فقہ اسلامی کا اصولِ تخارج اس قانون کا جزء بنا دیا جائے تو اس حق تلفی اور استحصال کا (جو صریح منکر اور بغی ہے) سد باب ہو سکتا ہے۔ غالباً اب تک کسی نے حکومت کی توجہ ادھر مبذول ہی نہیں کرائی' ورنہ یہ کوئی مشکل علاج نہیں ہے۔

﴿وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ ......﴾

اب ہم اس آیۂ مبارکہ کے دوسرے حصے کو لیتے ہیں' جس میں تین مأمورات (اور واجبات) کے مقابلے پر تین ہی منہیات اور ممنوعات کا ذکر ہے۔ اور جس میں اللہ تعالیٰ نے فرد اور معاشرے کو برباد کرنے والی تین خرابیوں سے منع فرمایا ہے' یعنی الفحشاء' المنکر اور البغی —— جن کی تفصیل یوں ہے۔

(ا) الفحشاء

عربی زبان میں فحش' فاحشة (جس کی جمع فواحش آتی ہے) اور فحشاء تینوں قریب قریب ہم معنی کلمات ہیں۔ اور ان میں سے مؤخر الذکر دو لفظ قرآن کریم میں بکثرت مستعمل ہوئے ہیں۔ فحشاء (جو سرّاء اور ضرّاء کی طرح مصدر بمعنی اسم ہے) کے لفظی معنی ہیں ہر وہ قول و فعل جس کا قبح (برائی) حد سے زیادہ ہو[۴۴] اور مفسرین نے ان ہی معنوں کو مختلف طریقوں سے سمجھایا ہے۔

(ا) ما عظم قبحه ومفسدته [۴۵]

یعنی ''جس کا قبح اور فساد بہت زیادہ ہو''۔

(۲) كل قبيح من قول او فعل وغايته الزنا[۴۶]

یعنی ''ہر انتہائی برا قول اور فعل' اور اس کی انتہائی صورت زنا ہے''۔

(۳) الفواحش ما جاوز حدود الله [۴۷]

یعنی ''وہ تمام کام فواحش ہیں جن میں اللہ کی مقرر کردہ حدود سے صریح تجاوز ہو۔''

(۴) **الفحشاء ما یقصده الانسان فی نفسه من القبیح مما لا یظهره**(۴۸)

یعنی ''ہر وہ فعل قبیح جس کا انسان ارادہ کرتا ہے مگر اسے ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔''

(۵) **فحشاء** سے مراد وہ تمام برائیاں ہیں جو مروّت کو برباد کرتی اور بدنامی کا باعث بنتی ہیں۔(۴۹)

ان مختلف اقوال کی روشنی میں تمام بے ہودہ اور شرمناک افعال **فحشاء** میں شمار ہوتے ہیں اور اسی لیے اس کا اردو ترجمہ ''بے حیائی'' اور ''بے شرمی'' کیا جاتا ہے۔[انگریزی مترجمین نے بھی اس کا ترجمہ عموماً shameful deeds کیا ہے' مثلاً یوسف علی اور اسد]۔ اور اس سے مراد زنا' بخل' زبان درازی' دشنام طرازی' تبرج اور برہنگی وعریانی وغیرہ لیے گئے ہیں۔ اور ان سب کے لیے جامع لفظ ''بے حیائی'' ہی زیادہ موزوں ہے۔ خصوصاً اس لیے بھی کہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں **فاحشه** '**فحشاء** اور **فواحش** کے الفاظ زیادہ تر جنسی بے راہ روی کے ضمن میں استعمال ہوئے ہیں[ہم بغرض اختصار صرف متعلقہ آیات کے حوالہ پر اکتفا کرتے ہیں۔ مثلاً النساء: ۱۵' ۲۵' الاعراف: ۸۰' یوسف: ۲۴' النور: ۱۹' النمل: ۵۴ اور العنکبوت: ۲۸] بلکہ بہت سے مفسرین نے تو اس آیت (النحل: ۹۰) میں **فحشاء** سے مراد زنا ہی لیا ہے۔(۵۰)

بہرحال تمام فواحش کا انسداد اور امتناع قرآن کریم کا ایک اہم موضوع ہے اور اس مقصد کی طرف کئی طریقوں سے توجہ دلائی گئی ہے' مثلاً:

(۱) شخصی اور انفرادی سطح پر قرآن کریم نے ''**فحشاء**'' سے بچنے کا ایک مؤثر ذریعہ نماز کو قرار دیا ہے: ﴿اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ ؕ﴾(العنکبوت: ۴۵)

(۲) قرآن کریم نے فواحش کے قریب بھی نہ پھٹکنے کا حکم دیا ہے' نہ علانیہ اور نہ چوری چھپے۔ فرمایا: ﴿وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ﴾(الانعام: ۱۵۱)

(۳) اسی طرح قرآن کریم میں فواحش کے علانیہ یا خفیہ ارتکاب کو قطعاً حرام قرار دیا گیا ہے:

﴿قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ﴾(الاعراف: ۳۳)

ان قرآنی احکام کی روشنی میں (جو آیت زیر مطالعہ کی تائید اور وضاحت کرتے ہیں) بے حیائی اور جنسی بے راہ روی کی طرف لے جانے والے ہر راستے کو بند کرنے کے لیے قانونی' تعلیمی اور انتظامی اقدامات کرنا' اور کم از کم —— ان چیزوں کی حوصلہ شکنی کرنا —— اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ اور یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ **فحشاء** ایک متعدی بیماری ہے۔ ایک دفعہ شروع ہو جائے تو وبا کی سی تیزی سے پھیلتی ہے۔ اور انسانی تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ مٹنے والی قوموں کے آخری دن ''فواحش کی بہار'' کے دن ہوتے ہیں —— ''طاؤس ورباب آخر!''

(۲) المُنکر

یہ لفظ بابِ افعال سے اسم مفعول ہے، جس کے لفظی معنی ہیں: (۱) جس کا انکار کیا جائے، یا جسے قبول نہ کیا جائے۔ اور (۲) جس سے جان پہچان نہ ہو۔

اسی بنا پر مفسرین نے ''منکر'' کی تعریف اور وضاحت یوں کی ہے:

(۱) **ما تنکرہ العقول** (۵۱)

''جسے عقل بھی برا کہے''۔ یعنی جسے عموماً سب لوگ برا جانتے ہوں یا ہمیشہ برا کہتے رہے ہیں۔

(۲) **کل ما انکرہ الشرع بالنھی** (۵۲)

یعنی جس کے بارے میں شریعت سے انکار اور منع ثابت ہو۔

(۳) **ما لا یعرف فی شریعۃ ولا سنۃ** (۵۳)

''جس کی شریعت اور سنت میں کوئی پہچان نہ ہو''۔ یعنی اس کے جواز کا کوئی شرعی ثبوت نہ ملتا ہو۔

(۴) جو کسی نبی کی شریعت میں جانا پہچانا نہ ہو یعنی جس سے تمام شرائع الٰہیہ نے منع کیا ہو۔ (۵۴)

(۵) **ما لا یوجب الحد فی الدنیا ولکن یوجب العذاب فی الآخرۃ** (۵۵)

جس کی دنیا میں کوئی شرعی سزا مقرر نہ ہو مگر آخرت میں باعث عذاب ہو۔

منکر کے تعین میں شریعت نے بڑی حد تک اجتماعی عقل انسانی پر بھروسہ کیا ہے، یعنی تمام وہ کام جو ہر مذہب وملت میں برے اور ناپسندیدہ سمجھے جاتے ہیں وہ منکرات ہیں۔ البتہ شریعت کے عمومی احکام سے منکر کی پہچان اور تمیز میں رہنمائی ضرور ملتی ہے، اور اس معاملے میں شریعت کی بالادستی تسلیم شدہ ہے (یعنی بصورتِ اختلافِ عقل وشرع)۔ اور اسی بنا پر اردو مترجمین نے منکر کا ترجمہ ''نامعقول کام''، ''برائی''، ''ناشائستہ حرکت''، ''ناپسندیدہ کام'' اور ''برے کام'' کیا ہے، جس میں عقل وشریعت کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

قرآن کریم نے منکرات کی روک تھام کو:

(۱) نبی کریم ﷺ کی خصوصی صفت کے طور پر بیان کیا ہے: ﴿وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (الاعراف: ۱۵۷)۔

(۲) اہل ایمان (مسلمان) حکمرانوں کی ایک خصوصیت یا ان کے فریضہ کے طور پر ذکر کیا ہے، یعنی ان کی دیگر صفات اور خصوصیات کے ساتھ اس کا بھی ذکر کیا ہے (تفصیل سورۃ الحج: ۴۱ میں ہے)۔

(۳) امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر، اہل ایمان کی خاص صفت اور ان کے فریضہ کے طور پر قرآن میں متعدد جگہ مذکور ہے۔ [مثلاً آلِ عمران: ۱۰۴، ۱۱۰، ۱۱۴، التوبۃ: ۶۷، ۷۱ اور لقمان: ۱۷]

اس کے برعکس منکرات اور برائیوں کو فروغ دینا منافقوں اور نام نہاد مسلمانوں کی خصوصیت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے: ﴿يَأْمُرُوْنَ بِالْمُنكَرِ﴾(التوبة:٦٧) یعنی وہ حکماً برے کام کراتے ہیں یا اپنے اختیار و اقتدار سے منکرات کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔

معاشرے میں منکرات کی روک تھام سے غافل ہونا یہودیوں کی ایک خاص برائی بیان ہوئی ہے: ﴿كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنكَرٍ فَعَلُوْهُ﴾(المائدة:٧٩)۔ اور حدیث شریف میں تو اس فریضہ سے غفلت کی بنا پر پورے معاشرے کے عذابِ الٰہی میں گرفتار ہونے کی وعید آئی ہے۔

منکرات کو فروغ دینے والوں کی کوششوں پر پانی پھیرنا اور ان کے عزائم کو خاک میں ملانا' یہ مسلمان عوام اور اسلامی حکومت کا فریضہ بھی ہے اور امتحان بھی۔ اور اس بارے میں یہ حدیثِ نبوی پوری رہنمائی بہم پہنچاتی ہے کہ: ((مَنْ رَاٰی مِنكُمْ مُنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ' فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ' فَاِنْ لَمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ' وَذٰلِكَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ))(اس حدیث کو مسلم نے ابوسعید خدریؓ سے مرفوعاً روایت کیا ہے) یعنی ''منکرات کا حسب استطاعت روکنا فریضہ ہے اور اس معاملے میں بے حسی تو عدم ایمان کی علامت ہے''۔

(۳) البغی

یہ تیسری بنیادی خرابی ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے۔ ''بغی'' کے لفظی معنی تو ''طلب'' کے ہیں (۵۶)۔ پھر اس میں ''حد سے بڑھنے کی خواہش'' اور کوشش یعنی عملاً حد سے تجاوز کر جانے کا مفہوم پیدا ہوتا ہے۔ مختار الصحاح میں ہے: ''**كل مجاوزة و افراط على المقدار الذى هو حد الشيء فهو لبغى**'' (۵۷)

یعنی کسی چیز کی مقررہ حد سے بڑھنا ہی ''بغی'' ہے۔ اس لیے مفسرین نے اس کی تعریف یوں کی ہے:

(۱) **طلب التطاول بالظلم** (۵۸) یعنی ظلم کے ساتھ توسیع پسندی۔

(۲) **هو الكبر والظلم والحسد والتعدى وحقيقته تجاوزُ الحد** (۵۹)
یعنی اس کی اصل تو ''حد سے بڑھنا'' ہے اور اس سے مراد تکبر' ظلم' حسد اور زیادتی ہے۔

(۳) طبری' طبرسی اور رازی نے یہاں (النحل:۹۰ میں) مراد ''**الكبر والظلم**'' ہی لیا ہے۔ (۶۰)

(۴) یہ لفظ (یعنی) قرآن میں حسد' نافرمانی اور ظلم کے معنوں میں آیا ہے اور ان میں سے ہر ایک معنی کی تائید مختلف آیات سے ہوتی ہے۔ (۶۱)

(۵) **هو الاستعلاء والاستيلاء على الناس والتجبر عليهم** (۶۲)
یعنی لوگوں پر مسلط ہونے اور زبردستی ان پر سرداری کرنے اور ان پر جبر و تشدد کرنا بغی ہے۔

(۶) **هو العدوان والاعتداء على الناس بالقول او الفعل** (۶۳)
قول و فعل سے لوگوں پر ظلم و زیادتی کرنا۔

(۷) الجوہری نے اسے فحشاء اور منکر کا مجموعہ قرار دیا ہے۔ (۶۴)

ان ہی اقوال کی روشنی میں اردو مترجمین نے بغی کا ترجمہ ’’تعدی‘‘، ’’سرکشی‘‘ اور ’’ظلم وزیادتی‘‘ کیا ہے۔ اور یہ چیز آیت کے مامورات یعنی عدل‘ احسان اور ایتاء ذی القربیٰ کی ضد ہے اور ان کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ ویسے تو عدل واحسان کے حکم میں ہی ’’بغی‘‘ کی حرمت سمجھی جاسکتی تھی‘ تاہم اللہ تعالیٰ نے اس کا الگ ذکر بطور خاص توجہ اور تاکید کے لیے کیا ہے اور اس کو آخر پر ذکر کیا ہے‘ کیونکہ یہ باقی خرابیوں کا مجموعہ بھی ہے اور جڑ بھی۔ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر اس قول وفعل سے اجتناب کرے جس میں دوسروں پر ’’ظلم وزیادتی‘‘ کا کوئی پہلو بھی پایا جاتا ہو۔ اور اسلامی حکومت کا یہ فریضہ اوّلین ہے کہ لوگوں کی جان‘ مال اور آبرو کو ہر قسم کی تعدی اور ظلم سے بچایا جائے۔

﴿ یَعِظُکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَذَکَّرُوۡنَ ﴾

آیہ کے یہ اختتامی کلمات بھی توجہ طلب ہیں۔ مأمورات اور منہیات کا یہ بیان ایک حکم ہے اور اسی لیے ان میں ’’یامر‘‘ اور ’’ینھی‘‘ کے واضح لفظ آئے ہیں۔ تاہم اس حکم کے ذریعے تم کو (اے مسلمانو) سمجھانا بھی مقصود ہے‘ یعنی یہ ’’حکم برائے حکم‘‘ نہیں ہے بلکہ اس میں تمہاری ہی خیرخواہی مطلوب ہے۔ لہٰذا یہ اُمید کی جاتی ہے کہ تم اسے پلے باندھو گے اور ہر وقت یاد رکھو گے‘ اور اپنی انفرادی زندگی میں بھی اور اپنی اجتماعی اور ملی زندگی میں بھی قدم قدم پر اس سے راہنمائی حاصل کرتے رہو گے اور اس پر عمل پیرا رہو گے۔

غور سے دیکھا جائے تو آیت کا اصل مرکز اور محور ’’نظامِ عدل واحسان‘‘ ہی ہے‘ اس لیے کہ ’’ایتاء ذی القربیٰ‘‘ تو اسی عدل واحسان کے اتباع کی ہی ایک صورت ہے۔ اور فحشاء‘ منکر اور بغی [بے حیائی‘ برائی اور ظلم] عدل واحسان سے انحراف کی مختلف صورتیں ہیں۔

فرد یا معاشرے کی سلامتی‘ ترقی اور کمال آیت میں بیان کردہ مثبت عوامل کے فروغ اور منفی عوامل کے انسداد پر منحصر ہے۔ ہمارا —— حکومت کا اور عوام کا —— فرض ہے کہ عدل واحسان اور ایتاء ذی القربیٰ کا مطلب سمجھیں اور ان پر مبنی قدروں کو فروغ دیں۔ اور اسی طرح یہ بھی ہمارا —— سب کا —— ہر ایک کا —— فرض ہے کہ ہم فحشاء‘ منکر اور بغی کو پہچانیں اور اس کی روک تھام کے لیے جدوجہد کریں۔

یہی چیز ہمارے قرآن پر ایمان کی پختگی اور صاحب سیرت ﷺ سے قلبی وابستگی کی صداقت کا ایک امتحان بھی ہے اور اس کی ایک علامت بھی —— اور پھر یہی چیز —— مامورات سہ گانہ کا نفاذ اور منہیاتِ سہ گانہ کا انسداد —— ملک وملت کی عاقبت اور افرادِ ملت کی آخرت کو خطرات سے محفوظ کرنے کی شرط بھی ہے اور تدبیر بھی۔

حواشی

(۱) یہ ترجمہ بھی کسی ایک مترجم کا نہیں ہے بلکہ چھ مختلف تراجم سے منتخب ہے۔اس میں شیخ الہندؒ، عاشق الٰہی میرٹھیؒ احمد رضا خان، فتح محمد جالندھری، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور عبدالکریم پاریکھ میں سے ہر ایک کے ترجمہ کا ایک آدھ لفظ موجود ہے۔

(۲) اس رائے کا اظہار مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اپنے حاشیہ قرآن میں کیا ہے جو شیخ الہندؒ کے ترجمہ کے ساتھ شائع ہوا ہے (ص ۳۵۸۔ بجنور ایڈیشن) اور مصری مؤلف علی فکری نے اپنی کتاب ''البیان الفاصل'' میں صرف ''عدل'' پر ۱۱۳ صفحات (۱۲۳ تا ۲۳۵) اور ظلم و بغی پر ۱۶۰ صفحات (۲۳۶ تا ۳۹۶) میں بحث کی ہے۔

(۳) الرازی، ص ۱۰۰۔ (٤) المیبدی، ص ٤۳۸۔

(٥) مثلاً دیکھئے الطبری، ص ١٦۳، المیبدی، ص ٤٤٢، الطبرسی، ص ١١٤، الآلوسی، ص ١٨٧، القاسمی، ص ۳۸٥٠ اور ابن العربی، ص ١١٦١۔

(٦) تفصیل کے لیے دیکھئے المراغی، ص ١۳٠۔

(٧) المیبدی، ص ٤٤٢۔ الطبرسی، ص١١٤ ۔ الرازی، ص ١٠١ اور القاسمی، ص ۳۸٥١۔

(۸) الرازی، ص ١٠١۔

(۹) تفسیر ابن کثیر، ج۲، ص ٥۸٢۔ المراغی، ص ١۳١۔ الآلوسی، ص۲١۹۔ القاسمی، ص ۳۸٥٠۔

(١٠) الزرکلی، ج١، ص ۳٤٤۔

(١١) الزمخشری، ص ٤٢٥۔ الرازی، ص ١٠٠۔ مغنیه، ص ٥٤٥۔الادب المفرد، ص ۳۸۹۔

(١٢) تفصیل کے لیے دیکھئے الطبری، ص ١٦۳۔ الرازی:ص ١٠١۔ ابن العربی، ص ١١٦١۔

(١۳) مختار الصحاح تحت ماده "عدل" نیز ابن العربی، ص ١١٦٠۔

(١٤) الجوهری، ص ١٦٦۔ (١٥) القاسمی، ص ۳۸٥٠۔

(١٦) ابن العربی، ص ١١٦٠۔ (١٧) الطبرسی، ص ١١٤۔

(١۸) الآلوسی، ص ٢١٧۔ (١۹) فکری، ص ١۳٤۔

(٢٠) المیبدی، ص ٤۳۸۔

(٢١) مثلاً الطبری، ص ١٦۳۔ الطبرسی، ص ١١٤۔الرازی، ص ١٠١۔

(٢٢) المفردات تحت ماده "عدل" نیز الرازی، ص ١٠١۔

(٢۳) الجوهری، ص ١٧١۔١٧٢۔ (٢٤) فکری، ص ١۳٤ ملخصًا۔

(٢٥) الآلوسی، ص ٢١٧۔ (٢٦) الطبری، ص ٢١٧۔ المیبدی، ص ٤۳۸۔

(٢٧) الرازی، ص ١٠١۔

(٢۸) صحیحین کی مشہور حدیث جس میں جبریلؑ کے انسانی شکل میں آنحضورﷺ کے پاس آ کر کچھ سوال کرنے اور آپؐ کے جواب دینے کا ذکر ہے۔اس میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ ''احسان کیا ہے؟'' جس کا جواب

آنحضور ﷺ نے ان الفاظ میں دیا تھا (جو ابھی بیان کیے گئے ہیں) یہ خاصی لمبی حدیث ہے۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب الایمان کا افتتاح اسی حدیث سے ہوا ہے۔

(۲۹) الرازی، ص ۱۰٤۔ (۳۰) ابن العربی، ص ۱۱٦۱۔

(۳۱) تفصیل کے لیے دیکھئے الجوھری، ص ۱۸٦، ۱۸۷۔

(۳۲) قاموس قرآن تحت مادہ "حسن"۔ (۳۳) القاسمی، ص ۸٥۱۔

(۳٤) الطبرسی، ص ۱۱٤۔الآلوسی، ص ۲۱۷۔

(۳٥) المیبدی، ص ٤۳۹ ملخصًا۔ (۳٦) تفہیم القرآن، ج۲، ص ٥٦٥۔

(۳۷) المراغی، ص ۱۳۲۔ الآلوسی، ص ۱۷۔ (۳۸) الرازی، ص ۱۰٤۔

(۳۹) الطبرسی، ص ۱۱٤۔ (٤۰) الطبری، ص ۱٦۳۔

(٤۱) الطبرسی، ص ۱۱٤۔ (٤۲) القاسمی، ص ۳۸٥۰۔ الجوھری، ص ۱٦٦۔

(٤۳) ابن العربی، ص ۱۱٦۱۔ الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(٤٤) المفردات، ص ۳۷٤۔ (٤٥) الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(٤٦) ابن العربی، ص ۱۱٦۱۔ (٤۷) الزمخشری، ص ٤۲٥۔

(٤۸) الطبرسی، ص ۱۱٤۔ (٤۹) المیبدی، ص ٤٤۱ ملخصاً۔

(٥۰) مثلاً دیکھئے الطبری، ص۱٦۳۔ المیبدی، ص ٤٤۰۔ الرازی، ص۱۰۱اور الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(٥۱) الزمخشری، ص ٤۲٥۔ بعض شارحین کشاف کو اس میں ''اعتزال'' کی بو آئی ہے۔تاہم بات اتنی غلط بھی نہیں ہے۔بہر حال عقل کے ساتھ شرح بھی شامل کرنے سے بات مکمل ہو جاتی ہے۔

(٥۲) ابن العربی، ص ۱۱٦۱۔ القاسمی، ص ۳۸٥۰۔

(٥۳) الرازی، ص ۱۰۲۔ (٥٤) المیبدی، ص ٤٤۱ ملخصاً۔

(٥٥) الآلوسی، ص ۲۱۸۔ (٥٦) الزمخشری، ص ٤۲٥۔

(٥۷) مختار الصحاح تحت مادہ "بغی"۔ (٥۸) الزمخشری، ص ٤۲٥۔

(٥۹) ابن العربی، ص ۱۱٦۱۔

(٦۰) الطبری، ص ۱٦٤۔ الطبرسی، ص ۱۱٤ اور الرازی، ص ۱۰۲۔

(٦۱) تفصیل کے لیے دیکھئے المیبدی، ص ٤٤۷۔ (٦۲) الآلوسی، ص ۲۱۸۔

(٦۳) مغنیہ، ص ٥٤٥ نیز القاسمی، ص ۳۸٥۰۔ (٦٤) الجوھری، ص ۱٦٦۔

نوٹ: مندرجہ بالا حواشی میں تکرار کی وجہ سے طوالت سے بچنے کے لیے مصادر و مراجع کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا گیا ہے۔ذیل میں ابجدی ترتیب کے ساتھ مقالہ میں مذکور تمام حوالوں کے لیے ایک ''مفتاح المراجع'' دی جاتی ہے جس میں روایتی طریقے پر ہر مصدر اور مرجع کے بارے میں ضروری معلومات دی گئی ہیں۔ جس کتاب کا کوئی خاص جزء یہاں مذکور ہے حوالہ میں اسی کے صفحات کا ذکر ہے۔

مفتاح المراجع

(۱) الآلوسی : شهاب الدین محمود آلوسی، روح المعانی [جلد۱٤ فقط]، دار احیاء التراث العربی، بیروت (سنه ندارد)

(۲) ابن العربی: قاضی محمد بن عبداللّٰہ المعروف بابن العربی، احکام القرآن [قسم ثالث فقط] عیسی البابی القاهرة ۱۹۵۸/۱۳۷۷ء۔

(۳) الجوهری: الشیخ الجوهری الطنطاوی، الجوهری فی تفسیر القرآن [جزء ۸فقط] مصطفی البابی، القاهرة ۱۹٦۳/۱۳۸۳ء۔

(٤) الادب المفرد:امام محمد بن اسماعیل البخاری :الادب المفرد، طبع وزارة العدل، حکومت متحده عرب امارات ۱۹۸۱/۱٤۰۷ء۔

(۵) الرازی: فخر الدین محمد بن عمر الرازی، مفاتیح الغیب (التفسیر الکبیر) [جلد۲ فقط] المطبوعة البهیة القاهرة ۱۹۳۸/۱۳۵۷ء

(٦) الزرکلی:خیر الدین الزرکلی: الاعلام، الطبعة الثالثة، بیروت۱۹٦۹/۱۳۸۹ء۔

(۷) الزمخشری، محمود بن عمر الزمخشری: الکشاف (تفسیر) [جلد دوم فقط] مصطفی البابی، القاهرة ۱۹٦٦/۱۳۸۵ء

(۸) الطبری، محمد بن جریر الطبری: جامع البیان عن تاویل القرآن (تفسیر) [جلد ۱٤،فقط] مصطفٰی البابی، القاهرة ۱۹۵٤/۱۳۷۳ء۔

(۹) الطبرسی، الفضل بن الحسن الطبرسی : مجمع البیان (تفسیر) [جزء ۱٤ فقط] دار مکتبه الحیاة، بیروت ۱۹٦۱/۱۳۸۰ء۔

(۱۰) فکری، علی فکری : البیان الفاصل بین الحق والباطل، مصطفٰی البابی، القاهرة ۱۹٤۹/۱۳٦۸ء۔

(۱۱) القاسمی، محمد جمال الدین القاسمی: محاسن التاویل [جلد۱۰،فقط] عیسی البابی، القاهرة ۱۹۵۹/۱۳۷۸ء۔

(۱۲) قاموس قرآن، سید علی اکبر قرشی، قاموس قرآن، دار الکتب الاسلامیه، طهران (ایران) ۱۳٦۱۔

(۱۳) مختار الصحاح، الشیخ محمد بن ابی بکر الرازی : مختار الصحاح، طبعة دار المعارف، القاهرة ب۔ت۔

(۱٤) المراغی، احمد مصطفٰی المراغی، تفسیر المراغی [جلد٤ ۱،فقط] مصطفٰی البابی، القاهرة۱۹٦۳/۱۳۸۳۔

(۱۵) مغنیه، محمد جواد مغنیه : التفسیر الکاشف [جلد٤، فقط]دار العلم للملایین، بیروت، ۱۹۷۰ء۔

(۱٦) المفردات، الحسین بن محمد المعروف الراغب الاصفهان، المفردات فی غریب القرآن، مصطفٰی البابی، القاهرة ۱۹٦۱/۱۳۸۱۔

(۱۷) المیبدی، رشید الدین المیبدی : کشف الاسرار وعدة الابرار [ج۵، فقط] لسبعی علی اصغر حکمت۔ طهران ۱۳۸۰ھ۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین
کا اجمالی تجزیہ

از: ڈاکٹر اسرار احمد

ترتیب وتدوین: سید برہان علی

۱۹۷۷ء کے رمضان المبارک کے پہلے پندرہ دنوں میں ریڈیو پاکستان لاہور سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کی پندرہ تقاریر نشر ہوئی تھیں، جن میں سورۃ الفاتحہ سے سورۃ الکہف تک کے چیدہ چیدہ مضامین کا خلاصہ بیان کیا گیا تھا۔ قرآن حکیم کے نصف اوّل کے اہم مضامین پر مشتمل یہ تقاریر محترم ڈاکٹر صاحب نے خود قلم بند فرمائی تھیں، اور یہ ''قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ'' کے نام سے سالہا سال سے شائع ہو رہی ہیں۔ اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے کہ قرآن حکیم کے نصف آخر کے اہم مضامین بھی اسی طرح ضبط تحریر میں آ کر کتابی شکل میں پیش کیے جائیں، لیکن اب تک بوجوہ اس کی نوبت نہیں آ سکی تھی۔ کچھ عرصہ قبل ہمارے کوئٹہ کے ساتھی سید برہان علی صاحب نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور محترم ڈاکٹر صاحب کے نماز تراویح کے دوران بیان کیے گئے ''خلاصۂ مضامین قرآن'' کو تحریری انداز میں مرتب کرنا شروع کیا۔ ان کی اس کاوش کو مزید ایڈیٹنگ کے بعد حکمت قرآن کے صفحات کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ پیش نظر قسط میں سورۂ مریم، سورۂ طٰہٰ اور سورۃ الانبیاء کے مضامین کا اجمالی تجزیہ نذر قارئین ہے۔ ان شاء اللہ العزیز یہ سلسلہ تسلسل سے جاری رکھا جائے گا، تا آنکہ یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ (خ م خ)

سورۂ مریم

سورۂ مریم چھ رکوع اور ۹۸ آیات پر مشتمل ہے۔ اس سورۂ مبارکہ میں بعض انبیاءِ کرام علیہم السلام کا ذکر آیا ہے۔ قرآن حکیم میں انبیاء ورسل کا تذکرہ دو انداز سے ہوتا ہے۔ ایک قِصص الانبیاء یا قِصص النبیین یعنی انبیاء کے ذاتی کردار اور اُن کی سیرت وعظمت کا بیان، جبکہ دوسرا انداز انباء الرسل یا انبآءُ المرسلین کا ہے۔ یعنی

رسولوں کی خبریں۔ یہ وہ انداز ہے جو حضرات نوح‘ ہودٗ صالح‘ لوط‘ شعیب اور موسیٰ علیہم السلام کے ذکر میں پایا جاتا ہے۔ یعنی رسولوں کی دعوت کے جواب میں قوموں کا انکار اور اُس کے نتیجہ اور پاداش میں عذابِ الٰہی کا نزول۔ اس اعتبار سے سورۂ مریم کے بعد آنے والی سورۂ طٰہٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذکر پر مشتمل ہے‘ جبکہ سورۃ الانبیاء اور سورۂ مریم کا اصل موضوع قِصص النبیین ہے۔ سورۂ مریم میں زیادہ تفصیلی ذکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔ اس سے پہلے سورۂ آل عمران میں بھی ہم دیکھ چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہوا‘ لیکن عقیدۂ الوہیتِ مسیح کی نفی کے لیے آپؑ سے پہلے حضرات زکریا و یحییٰ علیہما السلام اور حضرت مریم سلامٌ علیہا کا ذکر بھی آیا ہے۔ وہ اس پہلو سے کہ اگر حضرت مسیح علیہ السلام کی معجزانہ ولادت الوہیتِ مسیح کی دلیل بن سکتی ہے تو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت بھی تو معجزانہ تھی۔ ان کے والدین انتہائی بڑھاپے کو پہنچے ہوئے تھے اور والدہ تو ساری عمر کی بانجھ تھی۔ اس بڑھاپے کے عالم میں ان کے ہاں جو ولادت ہوئی وہ عام طبعی قانون کے مطابق نہیں تھی بلکہ معجزانہ تھی۔

سورۂ مریم کے پہلے رکوع میں حضرت زکریا علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی رحمت کا ذکر ہے کہ جبکہ ان کی ہڈیاں کمزور اور سر سفید ہو چکا تھا اور بیوی بانجھ تھی‘ انہوں نے کس طرح اپنے ربّ کو آہستگی اور خاموشی کے ساتھ پکارا اور استدعا کی کہ ان کے بعد کارِ رسالت کو جاری رکھنے کے لیے ان کو ایک ولی عنایت فرما دیا جائے جو اُن کا اور آلِ یعقوب کا روحانی وارث ہو۔ چنانچہ اس دعا کے جواب میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ ان سے کہا گیا: ﴿یٰیَحۡیٰی خُذِ الۡکِتٰبَ بِقُوَّۃٍ﴾ (آیت ۱۲) ’’اے یحییٰ کتاب کو مضبوطی سے تھامو!‘‘ اس میں ہمارے لیے بھی تمسّک بالقرآن کا حکم پنہاں ہے‘ یعنی قرآن کو مضبوطی سے تھامو۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام کو بچپن میں ہی حکمت و دانائی عطا فرمائی گئی۔ جس طرح حضرت مسیح علیہ السلام نے پنگھوڑے میں معجزانہ طریقہ سے گفتگو فرمائی اسی طرح حضرت یحییٰ علیہ السلام پر ان کے بچپن ہی سے رشد و حکمت کے آثار ظاہر ہوئے۔

دوسرے رکوع میں حضرت مریم سلامٌ علیہا کے معجزانہ طور پر حاملہ ہونے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر ہوا ہے۔ اس ضمن میں وہ گفتگو خصوصی توجہ کی مستحق ہے جو انہوں نے پنگھوڑے میں فرمائی‘ جس میں اپنی والدہ کی عفت کی گواہی دی اور فرمایا:

> ’’میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے اُس نے کتاب عطا فرمائی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے۔ اور مجھے بابرکت بنایا ہے جہاں کہیں بھی میں رہوں‘ اور اُس نے مجھے نماز اور زکوٰۃ کی وصیت کی ہے جب تک میں زندہ رہوں۔ اور مجھے اپنی والدہ کا فرماں بردار اور حسن سلوک کرنے والا بنایا ہے اور جبار و شقی نہیں بنایا۔ اور سلام ہے مجھ پر جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں اور جس دن زندہ ہو کر اُٹھ کھڑا ہوں‘‘۔ (آیات ۳۰۔۳۳)

آپؑ کی یہ ساری گفتگو نقل کرنے کے بعد فرمایا:

﴿ ذٰلِکَ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ ...... ﴾

''یہ ہے عیسیٰ ابن مریم (کی اصل حقیقت)۔ یہ ہے وہ حق بات جس میں لوگ جھگڑتے ہیں (اور شک و شبہ میں مبتلا ہیں)۔ یہ اللہ کی شان ہی نہیں کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے' اس سے وہ پاک ہے۔ وہ تو جب کسی کام کا فیصلہ کرتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے''۔ (آیات ۳۴۔۳۵)

یہی وہ آیات تھیں جو حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی کے دربار میں پڑھی تھیں' جبکہ عمرو بن العاص کی سربراہی میں قریشِ مکہ کی سفارت وہاں مہاجرین حبشہ کو واپس لانے کے لیے گئی تھی (عمرو بن العاص بعد میں ایمان لے آئے تھے' صحابی ہیں رضی اللہ عنہ)۔ شاہِ نجاشی نے یہ آیات سن کر زمین سے ایک تنکا اٹھا کر کہا تھا کہ جو حقیقت ان آیات میں بیان ہوئی ہے' مسیحؑ اُس سے ایک تنکا بھر بھی زیادہ نہیں ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے مہاجرین کو واپس بھیجنے سے انکار کر دیا اور حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے کہا کہ جب تک چاہو یہاں امن و سکون کے ساتھ رہو۔

تیسرے رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کا ذکر اگرچہ بار بار آ رہا ہے۔ سورۃ الانعام' سورۂ ہود اور سورۂ یونس کے علاوہ سورۂ ابراہیم میں بھی آپؑ کا ذکر آیا ہے' لیکن یہاں پر ایک خاص پہلو سے ذکر ہوا ہے کہ انہوں نے توحید کی دعوت جب اپنے والد کو پیش کی تو کس انداز میں کی۔ یہ بات ہر خادمِ دین کے لیے بہت اہم ہے کہ اپنے سے بڑوں کو دعوت پیش کرتے ہوئے کیا انداز ہونا چاہیے۔ انہوں نے اپنے والد سے فرمایا کہ:

''ابا جان! آپ ان کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ کچھ سنتے ہیں' نہ دیکھتے ہیں اور نہ وہ آپ سے کسی مصیبت کو ہٹا سکتے ہیں۔ ابا جان! میرے پاس وہ علم آ چکا ہے جو آپ کے پاس نہیں آیا' لہٰذا آپ میرا اتباع کیجیے' میں آپ کی صحیح اور سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کروں گا۔ ابا جان! شیطان کی بندگی مت کیجیے' یقیناً شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا جان! مجھے اندیشہ ہے کہ عذابِ خداوندی آپ کو اپنے گھیرے میں نہ لے لے' پھر آپ شیطان کے ساتھیوں میں سے ہو جائیں''۔ اس پر والد نے ڈانٹ کر کہا: ''اے ابراہیم کیا تم میرے معبودوں کو چھوڑ رہے ہو؟ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کر دوں گا' دور ہو جاؤ میری نظروں سے''۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں کہا: ''آپ پر سلامتی ہو' میں تو آپ کے لیے اپنے ربّ سے استغفار ہی کروں گا' وہ یقیناً مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اور میں قطع تعلق کرتا ہوں آپ سے بھی اور اُن تمام چیزوں سے بھی جن کو آپ پوج رہے ہیں' اور میں تو اپنے رب ہی کو پکاروں گا' مجھے اُمید ہے کہ میں اپنے رب کو پکار کر نامراد نہیں رہوں گا''۔ (آیات ۴۲۔۴۸)

اس کے بعد حضرات اسحٰق' یعقوب' موسیٰ' ہارون' اسماعیل اور ادریس علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

''یہ وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے انبیاء کرامؑ میں سے آدم کی اولاد میں' اور ان میں جن کو سوار کرایا ہم نے نوحؑ کے ساتھ' اور ابراہیمؑ اور اسرائیلؑ کی اولاد میں' اور ان میں جن کو ہم نے ہدایت کی اور پسند کیا۔ (ان لوگوں کی شان یہ رہی ہے کہ) جب بھی اُن کے سامنے رحمٰن کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ فوراً سجدے میں گر جاتے ہیں اور روتے ہیں۔ (آیت سجدہ) البتہ اُن کے بعد اُن کی آئندہ نسلوں میں ایسے ناخلف لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے نماز کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے پڑ گئے' سو وہ عنقریب جہنم میں پڑ کر رہیں گے۔'' (آیات ۵۸۔۵۹)

ایک بات کا ذکر اس میں رسول اللہ ﷺ کے حوالہ سے آیا ہے۔ جب آپؐ نے جبرائیلؑ سے شکوہ کیا کہ آپ دیر دیر سے آتے ہیں' ذرا جلدی جلدی آیا کریں تو اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ کو سکھلا دیا کہ جواب میں یوں کہیں:

﴿وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّکَ ۚ لَہٗ مَا بَیْنَ اَیْدِیْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَیْنَ ذٰلِکَ ۚ وَمَا کَانَ رَبُّکَ نَسِیًّا ﴿۶۴﴾﴾

''ہم تو آپؐ کے ربّ کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے۔ اُسی کا ہے جو ہمارے آگے ہے اور جو ہمارے پیچھے ہے اور جو اس کے بیچ میں ہے۔ اور آپ کا ربّ بھولنے والا نہیں ہے۔''

آخری رکوع میں اس عقیدے کا ذکر ہوا ہے جس پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی غضب ظاہر ہوا ہے اور جس کا ذکر سورۂ کہف میں بھی آیا ہے' یعنی اللہ کے لیے اولاد تجویز کر لینا۔ اس پر اللہ کا جو غضب بھڑکا ہے اس کا اظہار پورے قرآن میں سب سے زیادہ سخت انداز میں اس مقام پر ہوا ہے۔ ارشاد ہوا کہ:

﴿لَقَدْ جِئْتُمْ شَیْئًا اِدًّا ﴿۸۹﴾ ......﴾

''تم اتنی عظیم گستاخانہ بات کر رہے ہو' جس کی وجہ سے آسمان پھٹ پڑنے اور زمین شق ہونے کو ہے اور پہاڑ دھماکے کے ساتھ گر جانے کو ہیں' کہ انہوں نے رحمٰن کے لیے بیٹا ہونے کا دعویٰ کیا۔ یہ رحمٰن کے شایانِ شان نہیں کہ وہ کسی کو بیٹا بنائے۔ جو کچھ بھی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ سب اللہ کے حضور بندے کی حیثیت میں پیش ہوں گے۔'' (آیات ۸۹۔۹۳)

آخری سے پہلی آیت خاص طور پر اس اعتبار سے اہم ہے کہ وہ مضمون اس میں اور زیادہ کھل کر آیا ہے جو اس سے قبل سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ الکہف میں آ چکا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کو تبشیر بھی اسی قرآن کے ذریعے سے کرنی ہے اور انذار بھی۔ فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾﴾

''(اے محمد ﷺ!) ہم نے اس قرآن کو آپ کی زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ آپ اس کے ذریعہ اہل تقویٰ کو بشارت دیں اور اس کے ذریعہ سے جھگڑالو قوم کو خبردار کر دیں۔''

سورۂ طٰہٰ

سورۂ طٰہٰ کے آٹھ رکوع اور ۱۳۵ آیات ہیں اور یہ تقریباً پوری کی پوری حضرت موسٰی علیہ السلام کے ذکر پر مشتمل ہے۔ قرآن مجید میں سورۂ یوسف اور سورۂ طٰہٰ دو سورتیں ایسی ہیں کہ جو تقریباً پوری کسی ایک نبی یا رسول کے حالات پر مشتمل ہیں۔ عجیب بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں بنی اسرائیل کے آباد ہونے کا ذریعہ بنے تھے‘ جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اُن کے وہاں سے غلامی سے نجات پا کر واپس ارضِ فلسطین تک آنے کا ذریعہ بنے۔ یعنی بنی اسرائیل کی تاریخ کا مصر میں قیام پر مشتمل جو دور ہے‘ اس کا نقطۂ آغاز حضرت یوسفؑ اور نقطۂ اختتام حضرت موسیٰؑ ہیں۔

سورۂ طٰہٰ کا آغاز ہی لفظ ''طٰہٰ'' سے ہوا ہے۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ طٰہٰ بھی محمد رسول اللہ ﷺ کا نام ہے اور یٰسٓ بھی۔ جس انداز میں یہ حروفِ مقطعات آئے ہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ آنحضور ﷺ سے خطاب کے لیے ہی استعمال ہوئے ہیں۔ سورۂ طٰہٰ کا آغاز ہوتا ہے:

﴿طٰہٰ ۚ مَآ اَنۡزَلۡنَا عَلَیۡکَ الۡقُرۡاٰنَ لِتَشۡقٰۤی ۙ﴾

''اے محمدؐ! ہم نے یہ قرآن آپ پر اس لیے نہیں نازل کیا ہے کہ آپ نامراد رہیں۔''

عام طور پر مترجمین نے لِتَشۡقٰی کا ترجمہ کیا ہے: ''تا کہ آپ مشقت میں پڑیں''۔ لیکن یہ مشقت سے نہیں بلکہ ''شقی'' سے مشتق ہے۔ جیسے کہ دو مرتبہ سورۂ مریم میں آیا ہے: ﴿لَمۡ اَکُنۡۢ بِدُعَآئِکَ رَبِّ شَقِیًّا ۝﴾ ''پروردگار! میں تجھ کو پکار کر کبھی نامراد نہیں رہا۔'' اور ﴿وَلَمۡ یَجۡعَلۡنِیۡ جَبَّارًا شَقِیًّا ۝﴾ ''اور مجھے سرکش اور بدبخت نہیں بنایا۔'' چنانچہ یہاں درحقیقت خوشخبری دی جا رہی ہے کہ اے نبی! آپ پر یہ قرآن اس لیے نازل نہیں ہوا کہ آپ ناکام ہوں یا آپ کفار سے مغلوب ہو جائیں‘ بالآخر آپ غالب آ کر رہیں گے‘ اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ البتہ درمیانی عرصہ میں تکالیف‘ امتحانات اور ابتلاء و آزمائش کا ایک دور ہے جس سے آپؐ کو اور آپؐ کے ساتھیوں کو گزرنا ہے۔

﴿اِلَّا تَذۡکِرَۃً لِّمَنۡ یَّخۡشٰی ۙ﴾

''یہ (قرآن) تو ایک تذکیر اور یاد دہانی ہے اُس کے لیے جو اللہ سے ڈرتا ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اُس کے الفاظ بھی اس سورت میں آئے ہیں۔ جب حضرت موسیٰؑ آگ کی تلاش میں کوہِ طور پر پہنچے تو آپؑ کو بایں الفاظ پکارا گیا:

''اے موسیٰ! یہ میں ہوں تمہارا رب‘ اپنے جوتے اُتار دو کہ تم طویٰ کی مقدس وادی میں ہو۔ اور میں نے تمہیں (ایک خاص مقصد کے لیے) منتخب کیا ہے‘ پس اسے توجہ سے سنو جو تم پر وحی کیا جا رہا ہے۔ یقیناً میں ہی اللہ ہوں‘ میرے سوا کوئی معبود نہیں‘ لہٰذا میری ہی بندگی اور پرستش کرو اور میری یاد کے

لیے نماز قائم کرو۔ اور یاد رکھو کہ قیامت آ کر رہے گی لیکن میں نے اُس (کے وقت معین) کو مخفی رکھا ہوا ہے تا کہ ہر ایک کو اُس کے کیے کا پورا بدلہ مل سکے۔ تو ایسے لوگ جو اس پر یقین نہیں رکھتے اور جو اپنی خواہشات کی پیروی کر رہے ہیں تمہیں قیامت (کے فکر یا اُس کے یقین) سے غافل نہ کر دیں' اگر ایسا ہوا تو تم ہلاک ہو جاؤ گے۔'' (آیات ۱۱۔۱۶)

اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس پہلی مخاطبت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف جانے کا حکم دیا گیا۔

﴿ اِذۡهَبۡ اِلٰى فِرۡعَوۡنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴾

''(اچھا تو اب) تم فرعون کے پاس جاؤ' وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔''

اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو دعا مانگی وہ دوسرے رکوع کے بالکل آغاز میں وارد ہوئی ہے۔ کسی بھی داعیٔ حق کے لیے جو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے کوشاں ہو' یہ دعا ہمیشہ ہمیش کے لیے نمونہ ہے کہ اپنے اہل وعیال میں سے' خاص طور پر اپنے بھائیوں میں سے اللہ تعالیٰ سے دعا کرے کہ اے پروردگار! ان کو میرے کام میں میرا شریک کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا:

''پروردگار! میرے سینے کو کھول دے' اور میرے لیے میرے کام کو آسان بنا دے' اور میری زبان میں جو گرہ پڑی ہوئی ہے اس کو کھول دے تا کہ یہ میری بات کو سمجھیں۔ اور میرے لیے میرے اپنے خاندان میں سے میرا ایک ساجھی بنا دے (جو میرا بوجھ بٹانے والا ہو)۔ میرے بھائی ہارون کو (میرا ساجھی بنا دے)۔ اس کے ذریعے سے میری کمر مضبوط کر دے اور اسے میرے اس کام میں شریک کر دے۔ تا کہ ہم دونوں مل کر کثرت سے تیری تسبیح بھی کریں اور کثرت سے تیرا ذکر بھی کریں۔ یقیناً تو ہمارے حالات کا دیکھنے والا ہے۔'' (آیات ۲۵۔۳۵)

اس پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ﴿قَدۡ اُوۡتِيۡتَ سُؤۡلَكَ يٰمُوۡسٰى﴾ ''اے موسیٰ تمہاری سب درخواستیں منظور!'' ——''اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اپنے ایک اور احسان کا ذکر فرمایا کہ ان کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ کو یہ بات الہام فرمائی تھی کہ اس بچے کو صندوق میں رکھ کر دریا میں ڈال دو۔ اس طرح فرعون کے گھر میں ان کی پرورش کا انتظام فرمایا۔ یہاں خاص طور پر اُس محبت وشفقت کا ذکر بھی فرمایا گیا جس کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر القاء ہوا تھا اور جو انہیں دیکھتا تھا اُن کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ فرمایا: ﴿وَاَلۡقَيۡتُ عَلَيۡكَ مَحَبَّةً مِّنِّىۡ ۚ وَلِتُصۡنَعَ عَلٰى عَيۡنِىۡ﴾ ''اور میں نے تم پر اپنی محبت کا ایک عکس ڈال دیا تھا' تا کہ تم میری نگرانی میں پرورش پاؤ۔'' میں نے یہ خصوصی اہتمام کیا تھا کہ تمہاری تربیت و پرورش خاص میری نگرانی میں ہو۔ پھر فرمایا کہ تم یہاں ایسے ہی نہیں پہنچ گئے ہو' یہ تو ہمارا طے شدہ فیصلہ تھا اور تقدیر الٰہی تھی جو تمہیں یہاں لے آئی ہے۔ ﴿ثُمَّ جِئۡتَ عَلٰى قَدَرٍ يّٰمُوۡسٰى﴾ اگلی آیت میں فرمایا کہ میں نے تمہیں ایک خاص مشن کے لیے تیار کیا ہے۔ پس اب تم اور تمہارا بھائی ہارون دونوں میری نشانیوں کے ساتھ فرعون کے پاس جاؤ......!

چھٹے رکوع میں قرآن حکیم کے حوالہ سے یہ بات آئی کہ ہم نے اس قرآن کو قرآنِ عربی بنا کر نازل کیا ہے اور اس میں ہم نے طرح طرح سے اپنی تمام دھمکیوں اور وعیدوں کو کھول کھول کر بیان کر دیا ہے تاکہ لوگ تقویٰ کی روش اختیار کریں یا اس کے ذریعے سے غور وفکر کی طرف مائل ہوں۔ اس کے بعد فرمایا:

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ الۡمَلِكُ الۡحَقُّ‌ۚ وَلَا تَعۡجَلۡ بِالۡقُرۡاٰنِ مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ يُّقۡضٰۤى اِلَيۡكَ وَحۡيُهٗ‌ وَقُلْ رَّبِّ زِدۡنِىۡ عِلۡمًا ۝﴾

''اللہ بہت بلند و برتر ہے' بادشاہِ حقیقی ہے۔ اے نبیؐ! آپ اس قرآن کے نزول کے لیے جلدی نہ کیجیے جب تک کہ آپؐ کی طرف اُس کی وحی تکمیل کو نہ پہنچ جائے' اور دعا کرتے رہیں کہ پروردگار' میرا علم اور زیادہ کر!''

آخری رکوع میں نبی اکرمﷺ سے خصوصی خطاب ہے' جیسے مکی سورتوں کا بالعموم اسلوب ہے۔ فرمایا:

''پس اے نبی! آپ صبر کریں اُس پر جو کچھ یہ کہہ رہے ہیں اور تسبیح کیا کریں اپنے رب کی حمد کے ساتھ سورج کے طلوع ہونے سے قبل بھی اور اس کے غروب ہونے کے بعد بھی۔ اور رات کے اوقات میں بھی اور دن کے دونوں اطراف میں بھی' شاید کہ آپ (ظہورِ نتائج سے) راضی ہو جائیں۔'' (آیت ۱۳۰)

پھر اُسی مضمون کا یہاں بھی اعادہ کیا گیا جو سورۃ الحجر میں تقریباً انہی الفاظ میں بیان ہو چکا ہے کہ:

''اے نبیؐ! اپنی نگاہیں ہرگز اُس دنیوی مال ومتاع اور ساز وسامان کی طرف نہ اٹھایئے کہ جو ہم نے ان گروہوں (کافروں اور مشرکوں) کو دے رکھا ہے (یہ صرف اس دنیا کی چمک دمک ہے' اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یہ ہم نے اِن کو صرف اس لیے دیا ہے) تاکہ اس کے ذریعہ ہم ان کو فتنہ میں مبتلا کر دیں۔ اور جو آپ کے رب کا رزق ہے وہ بہت بہتر اور باقی رہنے والا ہے''۔ (آیت ۱۳۱)

یہاں رزق سے کیا مراد ہے؟ ہم اس کی تاویل سورۃ الحجر کی آیت کی روشنی میں کریں گے: ﴿وَلَقَدۡ اٰتَيۡنٰكَ سَبۡعًا مِّنَ الۡمَثَانِىۡ وَالۡقُرۡاٰنَ الۡعَظِيۡمَ ۝﴾ چنانچہ اصل رزق اور اصل دولت یہ قرآن عظیم ہے۔

آگے فرمایا:

﴿وَاۡمُرۡ اَهۡلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصۡطَبِرۡ عَلَيۡهَا‌ؕ لَا نَسۡـئَلُكَ رِزۡقًا‌ؕ نَحۡنُ نَرۡزُقُكَ‌ؕ وَالۡعَاقِبَةُ لِلتَّقۡوٰى ۝﴾

''اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دیتے رہیے اور خود بھی اس پر جمے رہیے۔ ہم آپ سے رزق نہیں مانگ رہے' بلکہ رزق تو ہم آپ کو دیں گے۔ اور عاقبت کا گھر تو تقویٰ ہی کے لیے مخصوص ہے''۔

سورۃ الانبیاء

سورۃ الانبیاء سات رکوع اور ۱۱۲ آیات پر مشتمل ہے۔ سورۂ مبارکہ کا آغاز اس یاددہانی سے ہوا ہے کہ:

﴿اِقۡتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمۡ وَهُمۡ فِیۡ غَفۡلَةٍ مُّعۡرِضُوۡنَ ۚ﴾

''لوگوں کے لیے ان کے حساب کا وقت (یعنی قیامت کی گھڑی) قریب آ گیا ہے' اور وہ غفلت میں منہ موڑے ہوئے ہیں۔''

اس کے بعد قرآن حکیم کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ:

﴿لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡكُمۡ كِتٰبًا فِیۡهِ ذِكۡرُكُمۡ ؕ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ ﴾

''(لوگو!) ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب بھیجی ہے جس میں تمہارا ہی ذکر ہے۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں ہو؟''

آگے چل کر فرمایا:

''اس (قرآن) میں اُن کے لیے بھی ذکر ہے جو میرے ساتھ ہیں اور اُن لوگوں کا ذکر بھی ہے جو مجھ سے پہلے آئے ہیں۔ مگر اکثر لوگ حق کو جانتے نہیں' اس لیے اعراض کر رہے ہیں۔ (اے محمدؐ!) ہم نے آپ سے پہلے کسی رسول کو نہیں بھیجا مگر اُس کی طرف یہی وحی کرتے رہے ہیں کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں' لہٰذا صرف میری ہی بندگی کریں۔'' (آیات ۲۴۔۲۵)

تیسرے رکوع میں یہ مضمون آیا ہے کہ ﴿خُلِقَ الۡاِنۡسَانُ مِنۡ عَجَلٍ ؕ﴾ (آیت ۳۷) ''انسان کی سرشت میں جلد بازی ہے۔'' یہ مضمون سورۂ طٰہٰ میں بھی بیان ہوا ہے کہ جلد بازی تو خیر کے کاموں میں بھی مناسب نہیں ہوتی۔ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں بھی انسان ٹھہر ٹھہر کر آگے بڑھے گا تو اس میں پختگی ہوگی۔ اس کے برعکس اگر چھلانگیں یا زقند لگائے گا تو پھر وہ ناکام ہو جائے گا۔ جلد بازی انسان کے اندر کی ایک خلقی کمزوری ہے۔

سورۃ الانبیاء بھی ان سورتوں میں سے ہے جن میں انبیاء کے حالات و واقعات بیان ہوئے ہیں۔ آیت ۴۸ میں حضرت موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کا ذکر ہے۔ اس کے بعد پانچویں رکوع میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر خاصا طویل ہے۔ پھر حضرات لوط' اسحٰق اور یعقوب علیہم السلام کا ذکر ہے۔ حضراتِ نوح' داؤد' سلیمان اور ایوب علیہم السلام کا ذکر بھی آیا ہے۔ خصوصاً حضرت یونس علیہ السلام کی وہ دعا بہت اہم ہے جو ہم مسلمانوں میں بہت عام ہے اور جس ''آیت کریمہ'' کا ہم ختم بھی کرتے ہیں: ﴿لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنۡتَ سُبۡحٰنَكَ ٭ۖ اِنِّیۡ كُنۡتُ مِنَ الظّٰلِمِیۡنَ ﴾ یہ آیت درحقیقت معرفت الٰہی کا ایک عظیم خزانہ ہے کہ انسان اس کو سمجھ کر اس کے مطابق عمل کرے۔ اس کو ایک خاص طریقے سے لاکھ دو لاکھ دفعہ پڑھ لینے سے اس سے استفادہ کا حق ادا نہیں

ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ میں پہنچا دیا تو اس کے اندر کی تاریکیوں میں انہوں نے اپنے رب کو پکارا: ''پروردگار! تیرے سوا کوئی معبود نہیں ہے' تو پاک ہے' بے شک میں ہی قصور وار ہوں۔'' میں نے ہی اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ یہ بالکل وہی بات ہے کہ جو حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی دعا کی صورت میں سورۃ الاعراف میں نقل ہوئی ہے:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴾

''اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے' اور اگر تو ہمیں معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں کرے گا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔''

چنانچہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم وحوا علیہما السلام کی توبہ قبول فرمائی تھی اسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی۔ بفحوائے الفاظِ قرآنی:

﴿فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ ۙ وَنَجَّیْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ؕ وَكَذٰلِكَ نُـْۨجِی الْمُؤْمِنِیْنَ﴾

''پس ہم نے اس کی فریاد سن لی اور اُسے غم سے نجات دی' اور ہم ایمان والوں کو اسی طرح نجات دیا کرتے ہیں۔''

ان کے علاوہ حضرات زکریا' یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کا بھی ذکر آیا ہے اور حضرت مریم سلامٌ علیہا کا بھی۔

سورۃ الانبیاء کے آخر میں وہ آیت مبارکہ بھی آئی ہے جو ہمیں بہت محبوب ہے اور ہمارے ہاں سیرت کی تقاریر کا عنوان بنتی ہے: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ﴾ ''(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم!) ہم نے نہیں بھیجا ہے آپ کو مگر تمام جہان والوں کے لیے رحمت بنا کر۔'' پھر آخر میں ارشاد فرمایا گیا:

''(اے نبیؐ!) اگر یہ روگردانی کریں تو آپؐ کہہ دیجیے کہ میں نے تو تمہیں کھلے بندوں دعوت پہنچا دی ہے۔ باقی مجھے نہیں معلوم کہ جس عذاب کی دھمکی تمہیں دی جا رہی ہے وہ قریب ہے یا ابھی کچھ فاصلہ پر ہے۔ اللہ تعالیٰ بلند آواز سے کہی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے اور اُس سے بھی واقف ہے جو تم چھپاتے ہو۔ اور مجھے کیا معلوم' ہوسکتا ہے کہ یہ تاخیر تمہارے لیے ایک آزمائش کے طور پر ہو اور ابھی تمہیں کچھ دیر کی مہلت ملنے والی ہو۔ آخر کار پیغمبرؐ نے دعا کی کہ اے پروردگار! فیصلہ صادر فرما دے حق کے ساتھ۔ اور ہمارا پروردگار جو رحمٰن ہے اُسی سے مدد طلب کی جاتی ہے اُن تمام باتوں پر جو تم کر رہے ہو۔'' (آیات ۱۰۹۔۱۱۲)

(جاری ہے)

ترجمۂ قرآن مجید

مع صرفی و نحوی تشریح

افادات: حافظ احمد یار مرحوم

ترتیب و تدوین: لطف الرحمٰن خان

سورۂ آل عمران (مسلسل)

آیات ۱۲۱ تا ۱۲۳

﴿وَاِذۡ غَدَوۡتَ مِنۡ اَهۡلِكَ تُبَوِّئُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ مَقَاعِدَ لِلۡقِتَالِ‌ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ ۙ
اِذۡ هَمَّتۡ طَّآئِفَتٰنِ مِنۡكُمۡ اَنۡ تَفۡشَلَا ۙ وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا‌ ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلۡيَتَوَكَّلِ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ ۞
وَلَقَدۡ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدۡرٍ وَّاَنۡتُمۡ اَذِلَّةٌ ‌ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ ۝﴾

غ د و

غَدَا (ن) غُدُوًّا : صبح سویرے نکلنا' سویرے پہنچنا۔ (آیت زیر مطالعہ)

اُغۡدُ (فعل امر) : تو سویرے نکل۔ ﴿اَنِ اغۡدُوۡا عَلٰى حَرۡثِكُمۡ﴾ (القلم:۲۲) ''کہ تم لوگ صبح سویرے پہنچو اپنی کھیتی پر۔''

غَدَاۃٌ ج غُدُوٌّ: صبح سویرے کا وقت۔ ﴿الَّذِيۡنَ يَدۡعُوۡنَ رَبَّهُمۡ بِالۡغَدٰوةِ وَالۡعَشِىِّ﴾ (الکہف:۲۸) ''وہ لوگ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح کو اور شام کو۔'' ﴿يُسَبِّحُ لَهٗ فِيۡهَا بِالۡغُدُوِّ وَالۡاٰصَالِ﴾ (النور) ''وہ لوگ تسبیح کرتے ہیں اس کی اس میں صبحوں اور شاموں کو۔''

غَدٌ: آنے والی صبح یا دن (۱) آنے والا کل (۲) آنے والا قیامت کا دن۔ ﴿وَلَا تَقُوۡلَنَّ لِشَاىۡءٍ اِنِّىۡ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ۙ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ﴾ (الکہف) ''تم ہرگز مت کہنا کسی چیز کے لیے کہ میں کرنے والا ہوں اسے کل' سوائے اس کے کہ اگر چاہا اللہ نے۔'' ﴿وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ لِغَدٍ﴾ (الحشر:۱۸) ''اور چاہیے کہ دیکھے ہر جان اس کو جو اس نے آگے بھیجا قیامت کے دن کے لیے۔''

غَدِیَ (س) غَدًا و غَدَاءً : صبح کا ناشتہ کرنا یا دوپہر کا کھانا کھانا۔

غَدَاءٌ (اسم ذات) : صبح کا ناشتہ یا دوپہر کا کھانا۔ ﴿قَالَ لِفَتٰىهُ اٰتِنَا غَدَاءَ نَا﴾ (الکھف:٦٢) ''انہوں نے کہا اپنے خادم سے تو دے ہم کو ہمارا ناشتہ۔''

ھ م م

ھَمَّ (ن) ھَمًّا : پختہ ارادہ کرنا' ہمت کرنا۔ (آیت زیر مطالعہ)

اَھَمَّ (افعال) اِھْمَامًا : بے چین کرنا۔ ﴿وَطَائِفَةٌ قَدْ اَھَمَّتْھُمْ اَنْفُسُھُمْ﴾ (آل عمران:١٥٤) ''اور ایک جماعت ہے' بے چین کیا ہے جن کو ان کی جانوں نے۔''

ف ش ل

فَشِلَ (س) فَشَلًا : بزدلی دکھانا' ہمت ہارنا۔

و ک ل

وَکَلَ (ض) وَکْلًا : اپنا کام کسی کے سپرد کرنا' سونپنا۔

وَکِیْلٌ (فَعِیْلٌ کا وزن ہے اسم المفعول کے معنی میں) : سپرد کیا ہوا' سونپا ہوا یعنی نگہبان' کارساز۔ ﴿وَمَا اَنْتَ عَلَیْھِمْ بِوَکِیْلٍ ﴾ (الانعام) ''اور آپؐ ان کے نگہبان نہیں ہیں۔'' ﴿وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ وَّکِیْلٌ﴾ (الانعام) ''اور وہ ہر چیز کا کارساز ہے۔''

وَکَّلَ (تفعیل) تَوْکِیْلًا: کسی کو نگہبان مقرر کرنا۔ ﴿یَتَوَفّٰکُمْ مَّلَکُ الْمَوْتِ الَّذِیْ وُکِّلَ بِکُمْ﴾ (السجدۃ:١١) ''موت دیتا ہے تم لوگوں کو موت کا فرشتہ جس کو نگہبان مقرر کیا گیا تمہارا۔''

تَوَکَّلَ (تفعل) تَوَکُّلًا : قرآن مجید میں ''عَلٰی'' کے صلے کے ساتھ آیا ہے جس کے معنی ہیں کسی پر بھروسہ کرنا۔ ﴿اِنِّیْ تَوَکَّلْتُ عَلَی اللّٰهِ﴾ (ھود:٥٦) ''بے شک میں بھروسہ کرتا ہوں اللہ پر۔''

مُتَوَکِّلٌ (اسم فاعل) : بھروسہ کرنے والا۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ ﴾ (آل عمران) ''بے شک اللہ پسند کرتا ہے بھروسہ کرنے والوں کو۔''

ترکیب : ''غَدَوْتَ'' اور ''تُبَوِّئُ'' کا فاعل ان میں ''تَ'' اور ''اَنْتَ'' کی ضمائر ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے لیے ہیں۔ ''تُبَوِّئُ'' سے پہلے ''وَاِذْ'' محذوف ہے اور اس کا مفعولِ اوّل ''اَلْمُؤْمِنِیْنَ'' ہے اور ''مَقَاعِدَ'' مفعولِ ثانی ہے۔ ''اَنْ'' کی وجہ سے ''تَفْشَلَانِ'' کا نون گرا ہوا ہے۔

ترجمہ:

وَاِذْ : اور جب	غَدَوْتَ : آپؐ نکلے صبح کے وقت
مِنْ اَھْلِکَ: اپنے گھر والوں سے	تُبَوِّئُ: (اور جب) آپؐ ٹھکانہ دیتے تھے
الْمُؤْمِنِیْنَ : مؤمنوں کو	مَقَاعِدَ : بیٹھنے کی جگہوں میں

لِلْقِتَالِ : جنگ کے لیے	وَاللّٰهُ : اور اللہ
سَمِيْعٌ : سننے والا ہے	عَلِيْمٌ : جاننے والا ہے
اِذْ : جب	هَمَّتْ : ارادہ کیا
طَّآئِفَتٰنِ : دو جماعتوں نے	مِنْكُمْ : تم میں سے
اَنْ : کہ	تَفْشَلَا : وہ دونوں ہمت ہاریں
وَ : حالانکہ	اللّٰهُ : اللہ
وَلِيُّهُمَا : ان کا پشت پناہ تھا	وَعَلَى اللّٰهِ : اور اللہ پر ہی
فَلْيَتَوَكَّلِ : چاہیے کہ بھروسہ کریں	الْمُؤْمِنُوْنَ : ایمان لانے والے
وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ : اور مدد کر چکا ہے تمہاری	اللّٰهُ : اللہ
بِبَدْرٍ : بدر میں	وَّ : حالانکہ
اَنْتُمْ : تم لوگ	اَذِلَّـةٌ : نرم (چارہ) تھے
فَاتَّـقُوا : پس تم لوگ تقویٰ اختیار کرو	اللّٰهَ : اللہ کا
لَـعَلَّـكُمْ : شاید کہ تم لوگ	تَشْكُرُوْنَ : شکر ادا کرو

نوٹ : یہاں سے اب جنگ اُحد پر تبصرہ شروع ہو رہا ہے۔ اور یہاں جن دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے وہ قبیلۂ خزرج کے بنوسلمہ اور قبیلۂ اوس کے بنو حارثہ ہیں۔ منافقوں کی شرارت کی وجہ سے ان میں کچھ کم ہمتی پیدا ہوئی تھی لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ (تدبر قرآن)

آیات ۱۲۴ تا ۱۲۷

﴿اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۞ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ۞ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۞ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ۞﴾

ف و ر

فَارَ (ن) فَوْرًا : جوش مارنا، اُبلنا۔ ﴿وَفَارَ التَّنُّوْرُ﴾ (ھود: ٤٠) ''اور اُبلا تنور۔''

فَوْرٌ (اسم ذات بھی ہے): جوش، اُبال۔ (آیت زیر مطالعہ)

ط ر ف

طَرَفَ (ض) طَرْفًا : کسی کو کسی چیز کے کنارے پر کرنا۔

طَرْفٌ (اسم ذات بھی ہے) : (۱) کسی چیز کا کنارہ' پہلو۔ (۲) آنکھ کی پلک۔ ﴿قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْکَ طَرْفُکَ﴾ (النمل:٤٠) ''قبل اس کے کہ لوٹے آپ کی طرف آپ کی پلک۔''

ک ب ت

کَبَتَ (ض) کَبْتًا : کسی کو ذلیل کرنا۔ (آیت زیر مطالعہ)

خ ی ب

خَابَ (ض) خَیْبَۃً: مقصد میں ناکام ہونا' نامراد ہونا۔ ﴿وَخَابَ کُلُّ جَبَّارٍ عَنِیْدٍ﴾ (ابرٰھیم) ''اور نامراد ہوا ہر ایک سرکش ہٹ دھرم۔''

خَائِبٌ (اسم الفاعل) : نامراد ہونے والا۔ (آیت زیر مطالعہ)

ترکیب: ''کُمْ'' کی ضمیر ''یَکْفِیَ'' کا مفعول ہے اور آگے ''اَنْ یُمِدَّ'' سے ''مُنْزَلِیْنَ'' تک پورا فقرہ اس کا فاعل ہے۔ ''مُنْزَلِیْنَ'' اگر ''مَلٰئِکَۃِ'' کی صفت ہوتا تو پھر ''اَلْمُنْزَلِیْنَ'' آتا' اس لیے یہ ان کا حال ہے۔ اسی طرح ''مُسَوِّمِیْنَ'' بھی حال ہے۔ ''مَا جَعَلَہٗ'' میں ''ہٗ'' کی ضمیر مفعولی گزشتہ بات کے لیے ہے جس میں مدد کا ذکر ہے۔ اور ''جَعَلَ'' کا مفعول ثانی ''بُشْرٰی'' ہے۔ ''بِہٖ'' کی ضمیر ''بُشْرٰی'' کے لیے ہے جو مؤنث غیر حقیقی ہے' اس لیے مذکر ضمیر بھی جائز ہے۔ ''اَلنَّصْرُ'' پر لام جنس ہے۔ ''لِیَقْطَعَ'' کا فاعل اس میں ''ھُوَ'' کی ضمیر ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ ''فَا'' سببیہ کی وجہ سے ''یَنْقَلِبُوْا'' منصوب ہوا ہے اور یہ فعل لازم ہے' اس لیے ''خَائِبِیْنَ'' اس کا مفعول نہیں ہوسکتا' بلکہ یہ اس کا حال ہے۔

ترجمہ:

اِذْ : جب	تَقُوْلُ : آپؐ کہتے تھے
لِلْمُؤْمِنِیْنَ : ایمان لانے والوں سے	اَ : کیا
لَنْ یَّکْفِیَکُمْ: ہرگز کافی نہیں ہوگا تم کو	اَنْ : (یہ) کہ
یُّمِدَّکُمْ : مدد کرے تمہاری	رَبُّکُمْ: تمہارا ربّ
بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ : تین ہزار	مِّنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ : فرشتوں سے
مُنْزَلِیْنَ : اتارے ہوئے ہوتے ہوئے	بَلٰٓی : کیوں نہیں
اِنْ : اگر	تَصْبِرُوْا : تم لوگ ثابت قدم رہو
وَتَتَّقُوْا: اور تقویٰ کرو	وَیَاْتُوْکُمْ : اور وہ آئیں تمہارے پاس
مِّنْ فَوْرِھِمْ ھٰذَا : اپنے اس جوش سے	یُمْدِدْکُمْ : تو مدد کرے گا تمہاری
رَبُّکُمْ: تمہارا رب	بِخَمْسَۃِ اٰلٰفٍ : پانچ ہزار

مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَةِ: فرشتوں سے
مُسَوِّمِیۡنَ: نشان لگانے والے ہوتے ہوئے
وَمَا جَعَلَهُ: اور نہیں بنایا اس کو
اللّٰهُ: اللہ نے
اِلَّا: مگر
بُشۡرٰی: ایک خوشخبری
لَکُمۡ: تمہارے لیے
وَلِتَطۡمَئِنَّ: اور تاکہ مطمئن ہوں
قُلُوۡبُکُمۡ: تمہارے دل
بِهٖ: اس سے
وَمَا النَّصۡرُ: اور کسی نوع کی کوئی مدد نہیں ہے
اِلَّا: مگر
مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ: اللہ کے پاس سے
الۡعَزِیۡزِ: جو بالادست ہے
الۡحَکِیۡمِ: حکمت والا ہے
لِیَقۡطَعَ: تاکہ وہ کاٹے
طَرَفًا: ایک پہلو کو
مِّنَ الَّذِیۡنَ: ان لوگوں سے جنہوں نے
کَفَرُوۡا: کفر کیا
اَوۡ: یا
یَکۡبِتَهُمۡ: وہ ذلیل کرے ان کو
فَیَنۡقَلِبُوۡا: نتیجتاً وہ لوگ پلٹیں
خَآئِبِیۡنَ: نامراد ہونے والے ہو کر

نوٹ: آیت ۱۲۴ میں رسول اللہ ﷺ کے قول کی آیت ۱۲۵ میں اللہ تعالیٰ نے تصدیق کی ہے' اور آپ ؐ کے اعزاز کے طور پر فرشتوں کی تعداد بڑھا دی' لیکن یہ وضاحت بھی کر دی کہ مدد کے لیے فرشتوں کا اُترنا ثابت قدمی اور تقویٰ کے ساتھ مشروط ہے۔ ساتھ ہی اس اصول کی وضاحت کر دی کہ مدد کی خواہ کوئی بھی نوعیت ہو اور خواہ وہ کسی کے لیے ہو' مدد بہر حال اللہ کی طرف سے ہی ہوتی ہے۔

جنگِ اُحد میں مسلمانوں نے ثابت قدمی کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جس کے نتیجے میں وہ جیتی ہوئی جنگ ہار گئے۔ اب یہ عجیب بات ہے کہ جنگ جیتنے کے باوجود مدینہ میں داخل ہو کر مسلمانوں کو ختم کر دینے کا حوصلہ کافروں کو نصیب نہیں ہوا۔ چنانچہ ذلیل وخوار ہو کر انہیں نامراد واپس جانا پڑا۔ یہ بھی اللہ کی مدد کا ایک انداز ہے۔

آیت ۱۲۸۔۱۲۹

﴿لَیۡسَ لَکَ مِنَ الۡاَمۡرِ شَیۡءٌ اَوۡ یَتُوۡبَ عَلَیۡهِمۡ اَوۡ یُعَذِّبَهُمۡ فَاِنَّهُمۡ ظٰلِمُوۡنَ وَلِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ یَغۡفِرُ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَیُعَذِّبُ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴾

ترکیب: ''شَیۡءٌ'' مبتدأ مؤخر نکرہ ہے اور ''لَیۡسَ'' کا اسم ہے۔ ''لَکَ'' قائم مقام خبر مقدم ہے اور ''مِنَ الۡاَمۡرِ'' متعلق خبر ہے۔ درمیان میں یہ جملۂ معترضہ ہے' کیونکہ آگے ''یَتُوۡبَ'' اور ''یُعَذِّبَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ گزشتہ آیت کے ''لِیَقۡطَعَ'' اور ''اَوۡ یَکۡبِتَهُمۡ'' پر عطف ہے۔ جملۂ معترضہ میں ''اَلۡاَمۡرِ'' پر لامِ تعریف انہی امور کے لیے ہے۔

ترجمہ:

لَیۡسَ: نہیں ہے	لَکَ: آپؐ کے لیے
مِنَ الۡاَمۡرِ: اس حکم میں سے	شَیۡءٌ: کوئی چیز
اَوۡ: یا	یَتُوۡبَ عَلَیۡهِمۡ: وہ توبہ قبول کرے ان کی
اَوۡ: یا	یُعَذِّبَهُمۡ: وہ عذاب دے ان کو
فَاِنَّهُمۡ: تو یقیناً وہ لوگ	ظٰلِمُوۡنَ: ظلم کرنے والے (تو) ہیں
وَلِلّٰهِ: اور اللہ کے لیے ہی ہے	مَا: وہ' جو
فِی السَّمٰوٰتِ: آسمانوں میں ہے	وَمَا: اور وہ' جو
فِی الۡاَرۡضِ: زمین میں ہے	یَغۡفِرُ: وہ بخشتا ہے
لِمَنۡ: اسے جس کو	یَّشَآءُ: وہ چاہتا ہے
وَیُعَذِّبُ: اور وہ عذاب دیتا ہے	مَنۡ: اسے جس کو
یَّشَآءُ: وہ چاہتا ہے	وَاللّٰهُ: اور اللہ
غَفُوۡرٌ: غفور ہے	رَّحِیۡمٌ: رحیم ہے

نوٹ: آیت ۱۲۸ میں خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہے لیکن اس کا حکم عام ہے کہ عزت و ذلت اور فتح و شکست کے فیصلے اللہ تعالیٰ خود کرتا ہے اور بلا شرکت غیرے کرتا ہے۔ ان میں کسی دوسری ہستی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔

آیات ۱۳۰ تا ۱۳۴

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَاۡکُلُوا الرِّبٰۤوا اَضۡعَافًا مُّضٰعَفَةً وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیۡۤ اُعِدَّتۡ لِلۡکٰفِرِیۡنَ ۝ وَاَطِیۡعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوۡلَ لَعَلَّکُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝ وَسَارِعُوۡۤا اِلٰی مَغۡفِرَةٍ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَجَنَّةٍ عَرۡضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالۡاَرۡضُ ۙ اُعِدَّتۡ لِلۡمُتَّقِیۡنَ ۝ الَّذِیۡنَ یُنۡفِقُوۡنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالۡکٰظِمِیۡنَ الۡغَیۡظَ وَالۡعَافِیۡنَ عَنِ النَّاسِ ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝﴾

ک ظ م

کَظَمَ (ض) کَظۡمًا: کسی چیز کی روانی کو روکنا' جیسے پانی' سانس یا جذبات وغیرہ روکنا۔

کَظَمَ (ض) کَظۡمًا وَ کُظُوۡمًا غَیۡظَهٗ: غصہ کو پی جانا۔

کَاظِمٌ (اسم الفاعل): روکنے والا۔ ﴿اِذِ الۡقُلُوۡبُ لَدَی الۡحَنَاجِرِ کٰظِمِیۡنَ ؕ﴾ (المؤمن:۱۸)

’’جب دل نرخروں کے پاس ہوں گے روکنے والے ہوتے ہوئے یعنی سانس گھوٹنے والے ہوتے ہوئے۔‘‘

مَكْظُوْمٌ (اسم المفعول) : روکا ہوا، غم زدہ۔ ﴿**اِذْ نَادٰی وَهُوَ مَكْظُوْمٌ** ❖﴾ (القلم) ’’جب اُس نے پکارا اس حال میں کہ وہ غم زدہ تھا۔‘‘

كَظِيْمٌ (**فَعِيْلٌ** کا وزن اسم المفعول کے معنی میں) : ہمیشہ سے غم زدہ۔ ﴿**وَابْيَضَّتْ عَيْنٰهُ مِنَ الْحُزْنِ فَهُوَ كَظِيْمٌ**﴾ (یوسف) ’’اور سفید ہوئیں انؑ کی دونوں آنکھیں غم سے اس حال میں کہ وہ مستقل غم زدہ ہیں۔‘‘

ترکیب : ’’لَا تَاْكُلُوْا‘‘ کا مفعول ’’الرِّبٰوا‘‘ ہے۔ مرکبِ توصیفی ’’اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً‘‘ حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ’’مَغْفِرَةٍ‘‘ نکرہ مخصوصہ ہے اور ’’مِنْ رَّبِّكُمْ‘‘ اس کی خصوصیت ہے۔ ’’اِلٰی‘‘ پر عطف ہونے کی وجہ سے ’’جَنَّةٍ‘‘ مجرور ہے اور یہ بھی نکرہ مخصوصہ ہے۔ ’’اَلَّذِيْنَ‘‘ گزشتہ آیت میں ’’لِلْمُتَّقِيْنَ‘‘ پر عطف ہے اور یہ پورا جملہ ان کی صفت ہے۔ ’’لِلْمُتَّقِيْنَ‘‘ کی صفت ہونے کی وجہ سے ’’اَلْكٰظِمِيْنَ‘‘ مجرور ہے اور یہ اسم الفاعل ہے، اس کا مفعول ’’اَلْغَيْظَ‘‘ ہے۔ ’’اَلْعَافِيْنَ‘‘ بھی ’’لِلْمُتَّقِيْنَ‘‘ کی صفت ہے۔

ترجمہ:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ: اے لوگو! جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے
لَا تَاْكُلُوا : تم لوگ مت کھاؤ	الرِّبٰٓوا : سود
اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً : ضرب دے کر کئی گنا کرتے ہوئے	وَاتَّقُوا : اور تقویٰ اختیار کرو
اللّٰهَ : اللہ کا	لَعَلَّكُمْ: شاید کہ تم
تُفْلِحُوْنَ : فلاح پاؤ	وَاتَّقُوا : اور تم لوگ بچو
النَّارَ الَّتِیْٓ : اس آگ سے جو	اُعِدَّتْ : تیار کی گئی
لِلْكٰفِرِيْنَ : انکار کرنے والوں کے لیے	وَاَطِيْعُوا : اور تم لوگ اطاعت کرو
اللّٰهَ : اللہ کی	وَالرَّسُوْلَ : اور اِن رسولؐ کی
لَعَلَّكُمْ: شاید کہ	تُرْحَمُوْنَ : تم لوگ رحم کیے جاؤ
وَسَارِعُوْٓا : اور تم لوگ لپکو	اِلٰی مَغْفِرَةٍ : ایک ایسی مغفرت کی طرف جو
مِّنْ رَّبِّكُمْ : تمہارے رب (کی طرف) سے ہے	وَجَنَّةٍ : اور ایک ایسی جنت کی طرف
عَرْضُهَا : جس کی چوڑائی	السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ: آسمان اور زمین ہیں

اُعِدَّتْ :وہ تیار کی گئی	لِلْمُتَّقِیْنَ :تقویٰ کرنے والوں کے لیے
الَّذِیْنَ :وہ لوگ جو	یُنْفِقُوْنَ :خرچ کرتے ہیں
فِی السَّرَّآءِ :خوشی میں	وَالضَّرَّآءِ :اور تکالیف میں
وَالْکٰظِمِیْنَ :اور جو روکنے والے ہیں	الْغَیْظَ :غیظ کو
وَالْعَافِیْنَ :اور جو درگزر کرنے والے ہیں	عَنِ النَّاسِ :لوگوں سے
وَاللّٰہُ :اور اللہ	یُحِبُّ :پسند کرتا ہے
الْمُحْسِنِیْنَ : بلاکم و کاست کام کرنے والوں کو	

آیات ۱۳۵ تا ۱۳۸

﴿وَالَّذِیْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَۃً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ ذَکَرُوا اللّٰہَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِھِمْ۪ وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ۪ وَلَمْ یُصِرُّوْا عَلٰی مَا فَعَلُوْا وَھُمْ یَعْلَمُوْنَ۝۱۳۵ اُولٰٓئِکَ جَزَآؤُھُمْ مَّغْفِرَۃٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَاط وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ۝۱۳۶ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِکُمْ سُنَنٌ لا فَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ۝۱۳۷ ھٰذَا بَیَانٌ لِّلنَّاسِ وَھُدًی وَّمَوْعِظَۃٌ لِّلْمُتَّقِیْنَ۝۱۳۸﴾

س ن ن

سَنَّ (ن) سَنًّا :کثیر المعانی لفظ ہے (۱) چھری تیز کرنا' دانت میں مسواک کرنا۔ (۲) آہستہ آہستہ پانی گرانا' گیلا کرنا۔ (۳) کوئی طریقہ اختیار کرنا' کسی طریقے کو عادت بنانا۔

مَسْنُوْنٌ (اسم المفعول) : پانی گرایا ہوا یعنی گیلا۔ ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ۝﴾ (الحجر) ''اور ہم نے پیدا کیا ہے انسان کو ایسی کھنکتی مٹی سے جو گیلے گارے سے تھی۔''

سِنٌّ (اسم ذات): دانت۔ ﴿وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ﴾ (المائدۃ:۴۵) ''اور کان کے بدلے کان اور دانت کے بدلے دانت۔''

سُنَّۃٌ ج سُنَنٌ (اسم ذات) :طریقہ' عادت۔ ﴿وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّۃِ اللّٰہِ تَبْدِیْلًا۝﴾ (الاحزاب) ''اور تو ہرگز نہیں پائے گا اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی۔''

س ی ر

سَارَ (ض) سَیْرًا :چلنا' سفر کرنا۔ ﴿وَّتَسِیْرُ الْجِبَالُ سَیْرًا۝﴾ (الطور) ''اور چلیں گے پہاڑ جیسا کہ چلنے کا حق ہے۔''

سِرْ ج سِیْرُوْا (فعل امر) :تو چل ۔(آیت زیرِ مطالعہ)

سَیَّارَۃٌ (فَعَّالٌ کے وزن پر مؤنث) : بار بار چلنے والی ۔ پھر اصطلاحاً قافلے اور قافلے والوں' دونوں کے لیے آتا ہے ۔ ﴿وَجَاءَتْ سَیَّارَۃٌ﴾ (یوسف:۱۹) ''اور آیا ایک قافلہ۔'' ﴿وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّکُمْ وَلِلسَّیَّارَۃِ﴾ (المائدۃ:۹۶) ''اور اس کا کھانا ایک سامان ہے تمہارے لیے اور قافلے والوں کے لیے۔''

سِیْرَۃٌ :طور طریقہ' خصلت ۔ ﴿سَنُعِیْدُهَا سِیْرَتَهَا الْاُوْلٰی ۝﴾ (طٰہٰ) ''ہم لوٹا دیں گے اس کو اس کی پہلی خصلت پر۔''

سَیَّرَ (تفعیل) تَسْیِیْرًا : چلانا' گھمانا پھرانا۔ ﴿هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ (یونس:۲۲) ''وہی ہے جو گھماتا پھراتا ہے تم لوگوں کو خشکی میں اور سمندر میں۔''

ترکیب: ''وَالَّذِیْنَ'' گزشتہ آیت میں ''لِلْمُتَّقِیْنَ'' پر عطف ہے۔ ''فَعَلُوْا'' سے ''اَنْفُسَهُمْ'' تک ''اِذَا'' کی شرط ہے۔ ''فَاحِشَۃً'' پر تائے مبالغہ ہے جیسے ''عَلَّامَۃٌ'' پر ہے۔ ''ذَکَرُوْا'' اور ''فَاسْتَغْفَرُوْا'' جوابِ شرط ہیں۔ ''خٰلِدِیْنَ'' حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اور اس سے پہلے ''هُمْ یَدْخُلُوْنَ'' محذوف ہے۔

ترجمہ:

وَالَّذِیْنَ :اور وہ لوگ جو	اِذَا :جب کبھی
فَعَلُوْا : کرتے ہیں	فَاحِشَۃً :کوئی کھلی گمراہی
اَوْ ظَلَمُوْآ :یا ظلم کرتے ہیں	اَنْفُسَهُمْ :اپنے آپ پر
ذَکَرُوا :تو وہ لوگ یاد کرتے ہیں	اللّٰهَ :اللہ کو
فَاسْتَغْفَرُوْا : پھر مغفرت چاہتے ہیں	لِذُنُوْبِهِمْ :اپنے گناہوں کی
وَمَنْ :اور کون	یَّغْفِرُ :بخشتا ہے
الذُّنُوْبَ : گناہوں کو	اِلَّا اللّٰهُ :سوائے اللہ کے
وَلَمْ یُصِرُّوْا :اور وہ ہرگز نہیں اَڑتے	عَلٰی مَا :اس پر جو
فَعَلُوْا :انہوں نے کیا	وَ :اس حال میں کہ
هُمْ :وہ لوگ	یَعْلَمُوْنَ :جانتے ہوں
اُولٰٓئِکَ وہ لوگ ہیں	جَزَآؤُهُمْ :جن کی جزا
مَّغْفِرَۃٌ :مغفرت ہے	مِّنْ رَّبِّهِمْ :ان کے ربّ (کی طرف) سے
وَجَنّٰتٌ :اور ایسے باغات ہیں	تَجْرِیْ :بہتی ہیں
مِنْ تَحْتِهَا :جن کے نیچے سے	الْاَنْهٰرُ :نہریں

خٰلِدِیْنَ: (وہ لوگ داخل ہوں گے) ہمیشہ رہنے والے ہوتے ہوئے	فِیْھَا: ان میں
وَنِعْمَ: اور کیا ہی اچھا ہے	اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ: عمل کرنے والوں کا اجر
قَدْ خَلَتْ: گزرے ہیں	مِنْ قَبْلِکُمْ: تم لوگوں سے پہلے
سُنَنٌ: کچھ طریقے	فَسِیْرُوْا: تو تم لوگ چلو پھرو
فِی الْاَرْضِ: زمین میں	فَانْظُرُوْا: پھر دیکھو
کَیْفَ: کیسا	کَانَ: تھا
عَاقِبَۃُ الْمُکَذِّبِیْنَ: جھٹلانے والوں کا انجام	ھٰذَا: یہ
بَیَانٌ: ایک خطبہ ہے	لِّلنَّاسِ: لوگوں کے لیے
وَھُدًی: اور ہدایت ہے	وَّمَوْعِظَۃٌ: اور ایک نصیحت ہے
لِّلْمُتَّقِیْنَ: تقویٰ کرنے والوں کے لیے	

آیات ۱۳۹ تا ۱۴۳

﴿وَلَا تَھِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ اِنْ یَّمْسَسْکُمْ قَرْحٌ
فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُہٗ ط وَتِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُھَا بَیْنَ النَّاسِ وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَیَتَّخِذَ مِنْکُمْ شُھَدَآءَ ط وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ ۝ وَلِیُمَحِّصَ اللّٰہُ الَّذِیْنَ
اٰمَنُوْا وَیَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ ۝ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّۃَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰہُ الَّذِیْنَ
جٰھَدُوْا مِنْکُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ● وَلَقَدْ کُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْہُ
فَقَدْ رَاَیْتُمُوْہُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۝﴾

و ھ ن

وَھَنَ (ض) وَھْنًا: (۱) جسمانی طور پر کمزور ہونا، سست ہونا۔ (۲) ارادہ اور ہمت کا کمزور ہونا، ہمت ہارنا۔ ﴿وَھَنَ الْعَظْمُ مِنِّیْ﴾ (مریم:٤) ''کمزور ہوئی ہڈی مجھ سے یعنی میری۔'' ﴿فَمَا وَھَنُوْا لِمَا اَصَابَھُمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ﴾ (آل عمران:١٤٦) ''تو وہ لوگ ہمت نہیں ہارے اس سے جو مصیبت آئی انہیں اللہ کی راہ میں۔''

وَھْنٌ (اسم ذات): کمزوری، تکلیف۔ ﴿حَمَلَتْہُ اُمُّہٗ وَھْنًا عَلٰی وَھْنٍ﴾ (لقمٰن:١٤) ''اٹھایا اس کو اس کی ماں نے تکلیف پر تکلیف میں ہوتے ہوئے۔''

اَوْھَنَ (افعال) اِیْھَانًا: کمزور کرنا۔

مُوْهِنٌ (اسم الفاعل): کمزور کرنے والا۔﴿وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ﴾ (الانفال) ''اور یہ کہ اللہ کافروں کے داؤں کو کمزور کرنے والا ہے۔''

ق ر ح

قَرَحَ (ف) قَرْحًا : زخمی کرنا۔

قَرْحٌ (اسم ذات) : زخم' چرکا۔(آیت زیر مطالعہ)

د و ل

دَالَ (ن) دَوْلًا' دُوْلَةً اور دَوْلَةً : زمانے کا ادل بدل ہونا۔یعنی جو حالت آج ایک کی ہے وہ کل دوسرے کی ہو جائے اور دوسرے کی حالت پہلے کی ہو جائے' کسی چیز کا گردش میں ہونا۔﴿كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَاۗءِ مِنْكُمْ﴾ (الحشر:۷) ''تا کہ وہ نہ ہو گردش میں تم میں سے غنی لوگوں کے مابین۔''

دَاوَلَ (مفاعلہ) مُدَاوَلَةً :ادل بدل کرنا' گردش دینا۔(آیت زیر مطالعہ)

م ح ص

مَحَصَ (ف) مَحْصًا : کسی چیز کو کرید کر اس کے ناپسندیدہ اجزا کو الگ کرنا' کسی چیز کو نکھارنا۔

مَحَّصَ (تفعیل) تَمْحِيصًا: بتدریج نکھارنا' کثرت سے یعنی بالکل نکھار دینا۔(آیت زیر مطالعہ)

ترکیب: ''اَعْلَوْنَ'' افعل التفضیل ''اَعْلٰی'' کی جمع ہے۔''اَفْعَلُ'' کے وزن پر یہ ''اَعْلَیُ'' بنتا ہے جو قاعدے کے مطابق تبدیل ہو کر ''اَعْلٰی'' استعمال ہوتا ہے۔اس کی جمع ''اَفْعَلُوْنَ'' کے وزن پر ''اَعْلَيُوْنَ'' بنتی ہے جو قاعدے کے مطابق ''اَعْلَوْنَ'' استعمال ہوتی ہے۔''اَلْقَوْمَ'' پر لام تعریف ہے۔ ''لِيُمَحِّصَ'' کے لام ''کَیْ'' پر عطف ہونے کی وجہ سے ''يُمْحِقَ'' منصوب ہے۔''لَمَّا'' جازمہ ہے اس لیے ''يَعْلَمِ'' دراصل ''يَعْلَمْ'' ہے۔آگے ملانے کے لیے اسے کسرہ دی گئی ہے۔جبکہ ''وَيَعْلَمَ'' کی نصب بتا رہی ہے کہ یہ گزشتہ آیت کے لام ''کَیْ'' پر عطف ہے۔''تَلْقَوْهُ'' اور ''رَاَيْتُمُوْهُ'' کی ضمیر مفعولی ''اَلْمَوْتَ'' کے لیے ہیں۔

ترجمہ:

وَلَا تَهِنُوْا : اور تم لوگ ہمت مت ہارو	وَلَا تَحْزَنُوْا : اور تم لوگ غمگین مت ہو
وَ : اس حال میں کہ	اَنْتُمُ : تم لوگ
الْاَعْلَوْنَ: برتر ہو	اِنْ كُنْتُمْ : اگر تم لوگ
مُّؤْمِنِيْنَ : ایمان لانے والے ہو	اِنْ يَّمْسَسْكُمْ : اگر لگا تم لوگوں کو
قَرْحٌ : کوئی چرکا	فَقَدْ مَسَّ : تو لگ چکا ہے
الْقَوْمَ : اس قوم کو	قَرْحٌ : ایک چرکا

مِّثْلُهٗ : اس کے جیسا	وَتِلْکَ الْاَیَّامُ اور یہ دن'
نُدَاوِلُھَا : ہم گردش دیتے ہیں ان کو	بَیْنَ النَّاسِ : لوگوں کے درمیان
وَلِیَعْلَمَ : اور (یہ اس لیے) کہ جان لے	اللّٰہُ : اللہ
الَّذِیْنَ : ان لوگوں کو جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے
وَیَتَّخِذَ : اور تاکہ وہ بنائے	مِنْکُمْ : تم میں سے
شُھَدَآءَ : گواہ	وَاللّٰہُ : اور اللہ
لَا یُحِبُّ : پسند نہیں کرتا	الظّٰلِمِیْنَ : ظالموں کو
وَلِیُمَحِّصَ : اور (اس لیے) کہ نکھار دے	اللّٰہُ : اللہ
الَّذِیْنَ : ان لوگوں کو جو	اٰمَنُوْا : ایمان لائے
وَیَمْحَقَ : اور تاکہ وہ گھٹائے	الْکٰفِرِیْنَ : کافروں کو
اَمْ حَسِبْتُمْ : کیا تم لوگوں نے خیال کیا	اَنْ تَدْخُلُوا : کہ تم لوگ داخل ہو گے
الْجَنَّـةَ : جنت میں	وَ : حالانکہ
لَمَّا یَعْلَمِ : ابھی تک نہیں جانا	اللّٰہُ : اللہ نے
الَّذِیْنَ : ان لوگوں کو جنہوں نے	جٰھَدُوْا : جدوجہد کی
مِنْکُمْ : تم میں سے	وَیَعْلَمَ : اور تاکہ وہ جان لے
الصّٰبِرِیْنَ : ثابت قدم رہنے والوں کو	وَلَقَدْ کُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ : اور بے شک تم لوگ تمنا کر چکے تھے
الْمَوْتَ : موت کی	مِنْ قَبْلِ : اس سے پہلے
اَنْ : کہ	تَلْقَوْہُ : تم لوگ سامنے آتے اس کے
فَقَدْ رَاَیْتُمُوْہُ : تو تم لوگ دیکھ چکے اس کو	وَ : اس حال میں کہ
اَنْتُمْ : تم لوگ	تَنْظُرُوْنَ : آنکھوں دیکھتے ہو

نوٹ : آیت ۱۴۰ میں ایام کو گردش دینے کا ایک مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جان لے کہ ہم میں سے کون سچ مچ ایمان لایا ہے۔ پھر آیت ۱۴۲ میں ایک دوسرے پیرائے میں اس کا اعادہ کیا گیا کہ جنت میں کوئی داخل نہیں ہوگا جب تک اللہ تعالیٰ یہ نہ جان لے کہ کس نے اس کی راہ میں جدوجہد کی اور کون ثابت قدم رہا۔ اب سوال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تو سب کچھ جانتا ہے' پھر اس کے جان لینے کا کیا مطلب ہے۔ اس بات کو سمجھ لیں۔

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر اللہ تعالیٰ کے لیے عالم الغیب کے الفاظ آئے ہیں' حالانکہ اللہ کے

لیے تو غیب ہے ہی نہیں' اس کے لیے تو ہر چیز ہر لحہ الشہادۃ ہے۔ اس لیے یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے عالم الغیب کے الفاظ کا استعمال ہماری نسبت سے کیا جاتا ہے' یعنی اللہ تعالیٰ اس کا بھی جاننے والا ہے جو ہمارے لیے غیب ہے۔ اسی طرح سے آیات زیر مطالعہ میں اور قرآن مجید میں دیگر مقامات پر' جہاں کہیں اللہ تعالیٰ کے لیے جان لینے کے الفاظ آئے ہیں' وہ ہماری نسبت سے ہیں اور ان کا مطلب یہ ہے کہ جس بات کو ہم نہیں جانتے انہیں اللہ تعالیٰ ظاہر کر دے' کھول دے یا ریکارڈ پر لے آئے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہر شخص کے کچھ ظاہری اقوال یعنی دعوے اور وعدے ہوتے ہیں اور کچھ ظاہری اعمال ہوتے ہیں' لیکن ان کے پیچھے کچھ باطنی کیفیات بھی ہوتی ہیں جن سے وہ شخص خود بھی اکثر اوقات پوری طرح باخبر نہیں ہوتا' لیکن اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ قیامت میں فیصلہ کرتے وقت وہ اقوال و اعمال بھی شامل کیے جائیں گے جو ریکارڈ پر آئے اور ان کو مٹایا نہیں گیا' یعنی عفو کی درخواست نہیں کی گئی۔ لیکن ان کے ساتھ باطنی کیفیات بھی شامل کی جائیں گی۔ اسی لیے بتا دیا کہ جب لوگوں کو قبروں سے نکالا جائے گا تو جو کچھ ان کے سینوں یعنی جی میں تھا وہ بھی حاصل کر لیا جائے گا۔ (العدیت: ۹' ۱۰)

باطنی کیفیات کن عناصر پر مشتمل ہوتی ہیں ان کی وضاحت بہت مشکل ہے اور انسان کے تمام جذبات و احساسات کو الفاظ کا جامہ پہنانا ممکن نہیں ہے۔ لیکن قرآن اور حدیث میں دو ایسے عناصر کی راہنمائی موجود ہے جو انسانی ذہن کی گرفت میں آ سکتے ہیں۔ ایک انسان کا حقیقی نظریہ اور عقیدہ جو بعض اوقات اس کے ظاہر سے مختلف ہوتا ہے اور دوسرے اس کی نیت۔

باطنی کیفیات کی اصل ضرورت تو آخرت میں پڑے گی لیکن کبھی کسی فرد یا کسی اجتماعیت کے مفاد کا تقاضا ہوتا ہے کہ ان کی باطنی کیفیات میں سے کسی عنصر کو ظاہر کر دیا جائے۔ پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے جب ہماری اس ضرورت کو پورا کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے لیے طریقہ کار (procedure) وہ ہے جسے ہم لوگ آزمائش کہتے ہیں۔ میدانِ اُحد میں مسلمانوں کی فتح کا شکست میں تبدیل ہو جانا بھی اسی طریقۂ کار کے تحت تھا تا کہ آئندہ مسلمان کوئی منصوبہ بندی کرتے وقت صرف افراد کی گنتی کو سامنے نہ رکھیں بلکہ ان میں باطنی کیفیات کے مختلف ہونے کی گنجائش بھی رکھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ نے دو مرتبہ مردم شماری کرائی تھی' اس کے بعد یہ سلسلہ منقطع ہو گیا۔ پہلی مردم شماری میں عورتوں اور بچوں سمیت مسلمانوں کی کل تعداد ۵۰۰ تھی اور دوسری میں ۱۵۰۰ تھی۔

آیت ۱۴۱ میں ''مَحَّصَ'' کا ترجمہ ہم نے ''نکھارنا'' کیا ہے۔ اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ باطنی کیفیات میں اگر کہیں کوئی کمی' خامی یا کجی رہ گئی ہے تو اسے دور کر دیا جائے۔

آخرت کے طالب بنو!

مدرس: پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

عَنْ جَابِرٍ رضی اللہ عنہ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((**اِنَّ اَخْوَفَ مَا اَتَخَوَّفُ عَلٰی اُمَّتِی الْهَوٰی وَطُوْلُ الْاَمَلِ، فَاَمَّا الْهَوٰی فَیَصُدُّ عَنِ الْحَقِّ، وَاَمَّا طُوْلُ الْاَمَلِ فَیُنْسِی الْاٰخِرَةَ، وَهٰذَا الدُّنْیَا مُرْتَحِلَةٌ ذَاهِبَةٌ، وَهٰذِهِ الْاٰخِرَةُ مُرْتَحِلَةٌ قَادِمَةٌ، وَلِكُلٍّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا بَنُوْنَ، فَاِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ لَّا تَكُوْنُوْا مِنْ بَنِی الدُّنْیَا فَافْعَلُوْا، فَاِنَّكُمُ الْیَوْمَ فِیْ دَارِ الْعَمَلِ وَلَا حِسَابَ، وَاَنْتُمْ غَدًا فِیْ دَارِ الْاٰخِرَةِ وَلَا عَمَلَ**))(رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' انہوں نے بیان کیا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں اپنی اُمت پر جن بلاؤں کے آنے سے ڈرتا ہوں' اُن میں سب سے زیادہ ڈر کی چیزیں ہویٰ اور طولِ اَمل ہے (یہاں ہویٰ سے مراد یہ ہے کہ دین و مذہب کے بارے میں اپنے نفس کے رجحانات اور خیالات کی پیروی کی جائے اور طولِ اَمل یہ ہے کہ دُنیوی زندگی کے بارے میں لمبی لمبی آرزوئیں دل میں پرورش کی جائیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ان دو بیماریوں کو بہت زیادہ خوفناک بتلایا اور آگے اس کی وجہ یہ ارشاد فرمائی) کہ ہویٰ تو آدمی کو قبولِ حق سے مانع ہوتی ہے (یعنی اپنے نفسانی رجحانات اور خیالات کی پیروی کرنے والا قبولِ حق اور اتباعِ ہدایت سے محروم رہتا ہے) اور طولِ اَمل (یعنی لمبی لمبی آرزوؤں میں دل پھنس جانا) آخرت کو بھلا دیتا ہے اور اس کی فکر اور اس کے لیے تیاری سے غافل کر دیتا ہے (اس کے بعد آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ) یہ دنیا دم بدم چلی جا رہی ہے' گزر رہی ہے (کہیں اس کا ٹھہراؤ اور مقام نہیں) اور آخرت (اُدھر سے) چل پڑی ہے' چلی آ رہی ہے۔ اور ان دونوں کے بچے ہیں (یعنی انسانوں میں کچھ وہ ہیں جو دنیا سے ایسی وابستگی رکھتے ہیں جیسی وابستگی بچوں کو اپنی ماں سے ہوتی ہے اور کچھ وہ ہیں جن کی ایسی ہی وابستگی اور رغبت بجائے دنیا کے آخرت سے ہے) پس اے لوگو! اگر تم کر سکو تو ایسا کرو کہ دنیا (سے چمٹنے والے اس) کے بچے نہ بنو (بلکہ اس دنیا کو دار العمل سمجھو) تم اس وقت دار العمل میں ہو (یہاں تمہیں صرف محنت اور کمائی کرنی ہے) اور یہاں حساب اور جزا و سزا نہیں ہے' اور کل تم (یہاں سے کوچ کر کے) دارِ آخرت میں پہنچ جانے والے ہو' اور وہاں کوئی عمل نہ ہوگا (بلکہ یہاں کے اعمال کا حساب ہوگا اور ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے گا)''۔

رسول اللہ ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں۔ آپ ؐ کو ہرگز یہ گوارا نہیں کہ اُمت کا کوئی فرد ناکام و نامراد اور خائب و خاسر رہے۔ چنانچہ آپ ؐ نے قدم قدم پر لوگوں کو اُن خطرات سے آگاہ کیا ہے جو اُن کے لیے دنیا و آخرت میں خسارے کا باعث ہیں۔ شرک اور غیر اللہ کی پرستش سے منع کیا ہے‘ والدین کی نافرمانی اور ہمسایوں کے ساتھ برے سلوک سے روکا ہے۔ غرض آپ ﷺ نے ہر اُس کام سے بچنے کی تلقین فرمائی ہے جو رذائل اخلاق میں آتے ہیں‘ یعنی جن سے حقوق اللہ اور حقوق العباد تلف ہوتے ہیں۔

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے ہویٰ اور طولِ اَمل میں گرفتار ہونے سے خبردار کیا ہے۔ ہویٰ سے مراد یہاں دین و مذہب کے بارے میں نفس کے رجحانات اور خیالات کی پیروی کرنا ہے اور طولِ اَمل وہ لمبی لمبی آرزوئیں ہیں جن کے پورا کرنے میں انسان اس قدر منہمک ہو جاتا ہے کہ اسے آخرت کی فکر نہیں رہتی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ہویٰ تو انسان کو قبولِ حق سے روکتی ہے۔ چنانچہ جس حق بات کو اس کا نفس گوارا نہیں کرتا اُسے وہ مسترد کر دیتا ہے اور من کی مرضی کے اعمال میں مشغول رہتا ہے۔ مثال کے طور پر سود کو حرام قرار دیا گیا ہے‘ مگر کوئی شخص اس حقیقت کو جاننے کے باوجود سودی کاروبار نہیں چھوڑتا۔ ایسا شخص ہوائے نفس میں مبتلا ہے۔ اسی طرح خواتین کو پردے کا حکم ہے کہ وہ گلیوں بازاروں میں حسن کی نمائش نہ کرتی پھریں‘ مگر یہ کام ان کو گوارا نہیں‘ بلکہ وہ بن سنور کر چست لباس پہن کر بے پردہ گھومتی پھرتی ہیں اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کرتی ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ اُن کا یہ طرزِ عمل خواہش نفس کے تابع ہے۔ انہوں نے اللہ کے احکام کے مقابلہ میں اپنی مرضی کو اختیار کیا ہوا ہے۔ ایسا طرزِ عمل سراسر ہلاکت ہے۔ اسی طرح جدید نظریات و افکار جو انسان کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں اُن کا اپنا نفس اُن کو قبول کر کے راضی ہے‘ مگر دین اور شریعت میں ان کی کوئی بنیاد نہیں‘ وہ گمراہی کی طرف لے جانے والے ہیں۔

تھوڑا سا غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ تمام بدعات کی بنیاد ہوائے نفس پر ہی ہے‘ اگرچہ لوگ انہیں دین کا کام اور کارِ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں مگر دین کے اندر اُن کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ وہ کام رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہیں اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کیے ہیں‘ مگر بعد کے اَدوار میں لوگوں نے محض ہوائے نفس کے تابع وہ بدعات شروع کر دیں اور اپنے نفس کی پسند کو اختیار کیا۔ حالانکہ بدعت کی شناعت کو رسول اللہ ﷺ نے دوٹوک انداز میں واضح کر دیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ڈالنے والی ہے۔‘‘ بدعات کو اختیار کرنے والے لوگ اگر غور کریں تو خود اُن پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ یہ عمل جب اُسوۂ حسنہ میں نہیں ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی ایسا نہیں کیا تو ضرور یہ بے فائدہ اور لایعنی ہے‘ اگرچہ یہ ہمارے نفس کو مرغوب ہے۔ ہوائے نفس کا یہی تو مطلب ہے کہ اپنے نفس کے پسندیدہ عمل کو قبول کر لینا بغیر یہ جانے کہ یہ عمل اُسوۂ حسنہ میں ہے یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اسے کیا ہے؟ پس ہر مسلمان کا طرزِ عمل یہ ہونا چاہیے کہ وہ صرف ایسے اعمال کو اختیار کرے جن کا حکم اللہ اور اس کے رسول ؐ

نے دیا ہے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان پر عمل کیا ہے' اور ہر اُس عمل کو بدعت سمجھ کر چھوڑ دے جو بعد کے لوگوں نے ایجاد کیا اور خیر القرون میں وہ نظر نہیں آتا' خواہ وہ بظاہر کتنا ہی خوش نما اور بھلا معلوم ہوتا ہو۔ اگر خواہش نفس کی پیروی کی جائے گی تو رسول اللہ ﷺ خبردار کر رہے ہیں کہ اس کا نتیجہ قبولِ حق میں رکاوٹ کا سبب بنے گا۔ انسان کا مزاج ایسا بگڑے گا کہ حق یا ناحق کی پہچان کرتے وقت اپنی خواہش کے مطابق فیصلہ کرے گا اور کتاب و سنت کو نظر انداز کرے گا۔ ظاہر ہے یہ طرزِ عمل سراسر ہلاکت ہے۔ نفس کی خواہشات پر کنٹرول کرنا آسان نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں نقل ہوا ہے' وہ اعتراف کرتے ہیں کہ: ﴿وَمَآ اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''میں اپنے نفس کو بریٔ الذمہ نہیں ٹھہراتا' بے شک نفس تو برائی پر ہی اُکساتا ہے''۔ جب ایک نبیؑ یہ بات کہہ رہے ہیں تو قیاس کر لیا جائے کہ ایک عام آدمی کا نفس اسے کس حد تک برائی پر آمادہ کرتا ہوگا اور اسے نفس امارہ سے کس قدر ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے!

دوسری بات جس سے رسول اللہ ﷺ نے اپنی اُمت کے حق میں خطرہ محسوس کیا ہے وہ طولِ اَمل ہے' جس کا مطلب ہے لمبی لمبی خواہشات میں پھنس جانا۔ یہ طرزِ عمل بھی انسان کو ہلاکت کے گڑھے میں ڈال دیتا ہے اور اسے خبر بھی نہیں ہوتی۔ دنیاوی ترقی کے سلسلہ میں انسان کے لمبے چوڑے پروگرام طولِ اَمل ہی کے ضمن میں آتے ہیں۔ اس حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے آگاہ کیا ہے کہ جو شخص طولِ اَمل میں پھنس جاتا ہے آخرت اُس کو یاد نہیں رہتی۔ آپ ﷺ کا یہ فرمان واضح حقیقت پر مبنی ہے' کیونکہ جو شخص دنیاوی زندگی کے لمبے پروگراموں میں پڑ جائے گا اُس کے ذہن اور دماغ پر ہر وقت اِس دنیا کی زندگی میں دوسروں پر سبقت لے جانے اور مال و جائیداد اکٹھی کرنے کا شوق سوار رہے گا اور آخرت کی زندگی کی حیثیت اس کے نزدیک صرف زبانی عقیدے کی ہوگی۔ کیونکہ جس شخص کو آخرت کی فکر لگ گئی وہ دنیا کی زندگی میں بس ناگزیر حد تک دلچسپی لے گا اور اس کی اصل دلچسپی اُن اعمال کو اختیار کرنے میں ہوگی جو اُس کی دائمی زندگی کو سنوارنے والے ہوں۔ یہی طرزِ عمل خود رسول اللہ ﷺ کا تھا اور یہی انداز فکر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا کہ اُن کے نزدیک دنیا دل لگانے کی نہیں بلکہ آخرت بنانے کی جگہ ہے۔

اس حدیث میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا یہ دنیا تو دم بدم چلی جا رہی ہے' گزر رہی ہے اور یہ جو آخرت ہے یہ آگے سے چل پڑی ہے اور چلی آ رہی ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں کے بچے ہیں' یعنی انسانوں میں کچھ ایسے ہیں جو دنیا سے ایسی محبت اور تعلق رکھتے ہیں جیسا کہ بچوں کو ماں کے ساتھ ہوتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کو ایسی ہی وابستگی اور رغبت دنیا کے بجائے آخرت کے ساتھ ہے۔ آنحضرت ﷺ جو اُمت کے غم خوار ہیں' نصیحت کرتے ہیں کہ جہاں تک تم سے ہو سکے دنیا کے بیٹے نہ بنو' یعنی دنیا کے ساتھ بس واجبی اور ناگزیر حد تک تعلق رکھو۔ تمہاری اصل دلچسپی آخرت کے ساتھ ہونی چاہیے۔ آپ ﷺ نے

فرمایا: (اپنی آخرت کے لیے) بھرپور عمل کرو' کیونکہ آج تم دارالعمل یعنی عمل کرنے کی جگہ میں ہو' یہاں تمہیں عمل کرنے کی آزادی ہے' تم اچھے کام بھی کر سکتے ہو اور برے کام بھی۔ یہاں حساب کتاب اور جزا و سزا نہیں ہے' اور کل تمہیں کوچ کر کے دارِ آخرت میں پہنچنا ہے' اور آخرت وہ جگہ ہے جہاں کوئی عمل نہ ہو گا' اگرچہ انسان چاہے گا کہ اب مجھے موقع دیا جائے تو اچھے عمل کروں گا مگر اُس وقت مہلت عمر گزار کر وہ دارالعمل سے دارالجزا میں پہنچ چکا ہو گا۔ اس طرح اُس کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکے گی' بلکہ حسرت کے ساتھ ہاتھ ملنے کے سوا وہ کچھ نہ کر سکے گا۔ دنیا کے یہ شب و روز بڑے قیمتی ہیں۔ ان کا صحیح استعمال کر کے انسان ابدی راحت حاصل کر سکتا ہے اور ان کو دنیا کی دلچسپیوں میں گزار کر اور شتر بے مہار کی طرح زندگی گزار کر ہمیشہ کی ناکامی اور نامرادی تک پہنچ جاتا ہے۔ دنیا کی خواہشات کو اگر آزاد چھوڑ دیا جائے تو ان کی کوئی حد نہیں' کیونکہ ہر خواہش سے آگے بھی ایک خواہش ہے۔ رسول اللہﷺ نے فرمایا: ''اگر آدمی کے پاس مال کی بھری ہوئی دو وادیاں ہوں تو وہ تیسری کی تمنا کرے گا اور آدمی کا پیٹ تو بس مٹی سے بھرے گا' اور اللہ اس بندے پر عنایت اور مہربانی فرماتا ہے جو اپنا رخ اور توجہ اس کی طرف کر لے۔'' (صحیحین)

دنیا کی دلچسپیوں میں بڑی کشش ہے' ان سے بچنا کوئی آسان کام نہیں۔ ادھر ابلیس ان دلچسپیوں کو مزید خوش نما بنا کر انسان کو ان کا گرویدہ بناتا ہے۔ پس دنیا کے ساتھ واجبی سا تعلق اسی صورت میں رہ سکتا ہے جب یادِ خدا اور فکرِ آخرت انسان کے سامنے ہر وقت مستحضر رہے اور وہ ہر عمل کرنے سے پہلے دیکھ لے کہ یہ کام آخرت میں کیا نتیجہ سامنے لائے گا' اللہ تعالیٰ کی خوشنودی یا اُس کی ناراضی؟

رسول اللہﷺ کا یہ فرمان ہمیں دو ہلاکتوں سے خبردار کر رہا ہے۔ ایک نفسانی خواہشات کی پیروی اور دوسرے دنیا کی زندگی میں لمبی لمبی خواہشات۔ آپﷺ کے سچے اُمتی کی زندگی تو اس نہج پر بسر ہونی چاہیے کہ وہ نفسانی خواہشات کی غلامی سے بچے' ہر کام دین و شریعت کی روشنی میں کرے' اس راہ میں آنے والے شیطانی وسوسوں سے باخبر رہے' شیطان کی ملمع سازیوں سے ہوشیار رہے۔ الغرض اپنی ہر خواہش کو اَطِیۡعُوا اللّٰہَ اور اَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ کے تابع رکھے' اور یہ اللہ کی توفیق کے بغیر نہیں ہوتا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَمَنۡ یُّوۡقَ شُحَّ نَفۡسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ﴾ ''اور جو شخص نفس کی خواہش سے بچا لیا گیا پس ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں''۔ پس اللہ تعالیٰ سے توفیق اور استقامت طلب کرتے رہنا چاہیے جس کے لیے آپﷺ نے ''لَا حَوۡلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ'' کا ذکر تلقین فرمایا ہے کہ ''کسی شخص میں نہ برائی سے بچنے کی ہمت ہے اور نہ نیکی کرنے کی طاقت مگر اللہ کی توفیق سے''۔ اسی طرح مال اور جائیداد کی کثرت کی خواہش پر قابو پانے کے لیے آپؐ نے اکسیر نسخہ بتا دیا کہ مال و دولت میں اپنے سے نیچے کے لوگوں کو دیکھو اور دین میں اپنے سے اونچے کو دیکھو تاکہ ناداروں اور مفلسوں کی کمزوری اور ناداری کو دیکھ کر جذبۂ شکر پیدا ہو اور دین میں اونچے لوگوں کو دیکھ کر نیکی میں آگے بڑھنے کا شوق پیدا ہو۔ ۞۞

انسانی جسم اور ذہن پر موسیقی کے اثرات

جدید سائنس کی روشنی میں

ڈاکٹر گوہر مشتاق (امریکہ)

بے شمار سائنسی تجربات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ موسیقی اور گانے بجانے کے اثرات ہمارے جسم اور ذہن دونوں پر مرتب ہوتے ہیں اور موسیقی ایک معصوم یا بے ضرر تفریح نہیں ہے۔ موسیقی دراصل نپی تلی اور منظّم آوازوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ موسیقی سننے سے ہمارے جسم اور کردار پر انتہائی دُور رَس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے موسیقی کی اِسی صفت کے متعلق فرمایا تھا:

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقاماتِ بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار

یہی وجہ ہے کہ قرآن اور حدیث کی تعلیمات میں موسیقی اور گانے بجانے کو تقریباً چودہ سو سال پہلے نقصان دہ قرار دے دیا گیا تھا۔ مفسر قرآن عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا تھا: ”**مِن ایَاتِہٖ مالا تُفَسَّرُ اِلاّ بِمُرُورِ الزَّمان**“ (اِس قرآن کی بعض آیات کی تفسیر صرف زمانہ گزرنے کے ساتھ سمجھ میں آئے گی)۔ موجودہ دور میں موسیقی کے زہر آلود اثرات کے متعلق بہت سی نئی سائنسی تحقیقات منظر عام پر آئی ہیں۔ اِس مضمون میں انسانی جسم اور دماغ پر موسیقی کے اثرات کو جدید سائنسی تحقیقات کے تناظر میں بیان کیا جائے گا۔

انسانی جسم پر حیاتیاتی اثرات

اِی اِی جی (Electroencephalography) ایک میڈیکل تکنیک ہے جس کے ذریعے دماغ کی برقی حرکت (Electrical Activity) کو ناپا جاتا ہے۔ انسانی دماغ پر موسیقی کے اثرات کا اندازہ لگانے کے لیے سائنسدانوں نے ای ای جی کی تکنیک استعمال کرتے ہوئے موسیقی سننے والوں کے سروں پر الیکٹروڈ لگائے۔ یہ مشاہدہ کیا گیا کہ موسیقی سننے کے دوران انسانی دماغ کے مختلف حصے متحرک ہو جاتے ہیں، جس کی ایک ممکنہ وجہ ان حصوں میں خون کے بہاؤ میں تبدیلی ہوتی ہے۔ یہ بھی نوٹ کیا گیا کہ خوشی کے اظہار والی موسیقی اور گانوں کے سننے سے دماغ کے بائیں حصے میں نسبتاً زیادہ حرکت نظر آتی ہے جبکہ خوف اور غم کے اظہار والی موسیقی کا زیادہ اثر دائیں دماغ پر مرتب ہوتا ہے۔

جب گانے کے ساتھ موسیقی کے آلات بھی شامل ہوں تو گانوں کے بول سامعین کے جذبات کے ساتھ کھیلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ تجربات نے یہ ثابت کیا ہے کہ سامعین پر شاعری اس صورت میں زیادہ قابل ترغیب اور گانے کا پیغام زیادہ پراثر ہوتا ہے جب گانے کے ساتھ گٹار کا استعمال بھی ہو بہ نسبت اس صورت میں جب کہ گانے کے ساتھ کوئی آلۂ موسیقی شامل نہ ہو۔

ان تحقیقات کا ماحصل یہ ہے کہ جب گانے کے ساتھ موسیقی بھی شامل ہو تو اس کی گناہ اور فحاشی پر ابھارنے کی طاقت کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔

انسانی دماغ پر حیاتیاتی اثرات

موسیقی بڑی حد تک منشیات کی طرح کام کرتی ہے' کیونکہ یہ انسان کو اپنے اردگرد کے ماحول سے بےخبر کردیتی ہے۔ وہ ذہن کو پرفریب حالت میں پہنچادیتی ہے۔ سائنس میں اس بات کے کافی شواہد موجود ہیں کہ موسیقی کی کئی اقسام ذہن پر منفی اثرات مرتب کرتی ہیں جس سے سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت کمزور ہو جاتی ہے۔ مثلاً دو مختلف یونیورسٹیوں میں کی گئی تحقیقات میں یہ دریافت ہوا کہ جب راک (Rock) میوزک لگایا گیا تو چوہوں کے لیے بھول بھلیوں میں اپنا راستہ معلوم کرنا عام حالات کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ مشکل ہوگیا۔ دوسرے الفاظ میں چوہوں کی سیکھنے کی صلاحیتیں موسیقی کے زیراثر کمزور پڑ گئیں۔

انسانی دماغ ایک ایسا عضو ہے جو غوروفکر' تقریر اور جذبات کا ذمہ دار ہے۔ یہ جسم کا کنٹرول سینٹر ہے۔ انسان کے دماغ کے اگلے حصے کے اندر گہرائی میں ایک نظام ہوتا ہے جو Limbic System کہلاتا ہے۔ اس میں ایمگڈیلا (Amygdala)، ہپوکیمپس (Hippocampus) اور ہائپو تھیلمس (Hypothalamus) جیسے حصے شامل ہوتے ہیں۔ لمبک سسٹم ہمارے جسم میں درج ذیل وظائف ادا کرتا ہے:

(۱) جذبات کو کنٹرول کرنا

(۲) جذباتی ردعمل

(۳) کیمیاوی مادوں کے جسم میں اخراج کو کنٹرول کرنا

(۴) مزاج (mood) کا کنٹرول

(۵) درد اور لذت کو محسوس کرنا

(۶) طویل المیعاد یادداشت

جذبات و احساسات مثلاً غصہ' خوف' جوش' محبت' نفرت' خوشی اور غم وغیرہ سب دماغ کے لمبک سینٹر میں پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کسی حادثے یا بیماری کی وجہ سے دماغ کے اس حصے کو نقصان پہنچ جائے تو انسان کی اظہارِ جذبات کی صلاحیت بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اس کی علامات میں بے وجہ رونا یا ہنسنا' جلد غصے میں

آ جانا، فکرو پریشانی، بہت زیادہ جنسی رجحان اور ڈپریشن وغیرہ شامل ہیں۔
موسیقی، منشیات اور جنسی خواہش کا آپس میں اتنا گہرا ربط ہے کہ یہ تینوں دماغ کے ایک ہی حصے یعنی Limbic System کو متحرک کرتے ہیں۔نوجوان موسیقی سے اس لیے لطف اندوز ہونا پسند کرتے ہیں کیونکہ یہ دماغ کے Limbic System کو متحرک کرتی ہے۔مزید برآں، دماغ کے اسی حصے کو جنسی ہارمونز بھی متحرک کرتے ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ ایک تحقیق کے مطابق شراب بھی دماغ کے اسی حصے پر اثر انداز ہوکر اس میں تحریک پیدا کرتی ہے اور مزاج میں تشدد اور جھگڑالو پن (aggression) پیدا کرتی ہے۔ ۳
کوکین اور کریک (Crack) جیسی منشیات بھی دماغ کے Limbic Area بالخصوص Hypothalamus پر اثر انداز ہو کر جسم میں بہت زیادہ تحریک، تشدد پسندی، بھوک کا فقدان اور پریشانی (nervousness) پیدا کرتی ہیں۔اس لیے یہ بات حیرانگی کا باعث نہیں کہ تشدد کے جرائم کی شرح ۱۵ سے ۲۴ سال کی عمر کے لوگوں میں سب سے زیادہ ہوتی ہے۔یونیورسٹی آف سین ڈی ایگو (University of San Diego) میں جب خودکشی کے ۱۳۰ واقعات کا تجزیہ کیا گیا تو ان میں سے ۶۶ فیصد کا بنیادی سبب شراب اور دیگر منشیات کا استعمال تھا۔
موسیقی جو نوجوانوں کی جنسی بے راہ روی، تشدد اور خودکشی کے بارے میں گفتگو کرتی ہے، ایک بہت بڑی معاشرتی بیماری ہے۔
دماغ کے Limbic System کا ایک حصہ ہپوکیمپس طویل المیعاد یادداشت کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔موسیقی دماغ کے اس حصے پر اثر انداز ہوکر جنسی بے راہ روی یا تشدد پر مبنی گانوں کو انسان کی بقیہ زندگی کے لیے اس کی یادداشت اور کردار کا حصہ بنا دیتی ہے۔

جنسی خواہشات کو ابھارنے میں موسیقی اور گانے کا کردار

چارلس ڈارون نے ۱۸۷۱ء میں طبع ہونے والی اپنی کتاب The Descent of Man and Selection in Relation to Sex میں یہ انکشاف کیا تھا کہ جنسی خواہشات کو ابھارنے میں موسیقی کا کردار اہم ہے، کیونکہ اس کے ذریعے جنس مخالف کو اپنی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔
یہ بات بیان کرنے کی حاجت نہیں کہ مشرق اور مغرب میں موسیقی اور گانے بجانے کا مرکزی موضوع عام طور پر جنس مخالف اور عشق بازی ہی ہوتا ہے۔دنیا کے اکثر رقص اپنے اندر جنسی عنصر رکھتے ہیں۔دنیا کے کئی قدیم جاہلی معاشروں میں موسیقی اور رقص کا شریک حیات کے انتخاب سے گہرا تعلق ہوتا تھا۔یہ چیز جانوروں میں کورٹ شپ کے دوران رقص سے مشابہ ہے۔مثلاً مور مورنی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اپنے خوبصورت پَرَ پھیلا کرناچتا ہے اور اس دوران آوازیں بھی نکالتا ہے (گویا کہ وہ گانا

گا رہا ہو)۔

موسیقی اور رقص کا عوام میں عام ہونا بلکہ اس سے نشے کی حد تک دلچسپی دراصل اس لیے ہے کیونکہ یہ چیزیں انسان کے سفلی جذبات کو اپیل کرتی ہیں۔ یونانی فلسفی افلاطون نے کہا تھا:

Rhythm and melody, accompanied by dance are the barbarous expression of the soul.

(موسیقی کا ترنم اور سوز' رقص کے ہمراہ دراصل انسانی روح کا وحشیانہ اظہار ہیں)۔

افلاطون نے اپنی کتاب Republic میں اس بات کا پرزور اظہار کیا تھا کہ عوامی میوزک کو سختی سے سنسر کیا جائے۔ اس نے اس خدشے کا اظہار کیا تھا کہ برے گانوں اور موسیقی کی وجہ سے ملک کے شہری گمراہ ہو جائیں گے' ان کے اخلاق تباہ ہو جائیں گے اور وہ برے کاموں میں ملوث ہو جائیں گے۔

موسیقی کی روح کو اس سے بھی زیادہ بہتر الفاظ میں مشہور ولی اللہ شیخ فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا تھا: اَلغِنَاءُ رقیۃُ الزِّنا یعنی'' گانا بجانا دراصل زنا کا ابتدائیہ ہوتا ہے۔'' (عوارف المعارف: شیخ شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ)

علاوہ ازیں' اس حقیقت سے بھی انکار مشکل ہے کہ نوجوانوں (Teenagers) پر عام لوگوں کی نسبت موسیقی زیادہ زہر آلود اثرات مرتب کرتی ہے۔ جب لڑکے اور لڑکیاں بلوغت کی عمر کو پہنچتے ہیں تو وہ موسیقی اور گانوں کے مروّجہ پیغامات سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں شائع شدہ ایک تحقیقی مقالے کے مطابق:

> ''نوجوانوں کے لیے موسیقی کئی لحاظ سے اہم ہے۔ مثلاً سوسائٹی کی اجتماعی زندگی میں ان کے شامل ہونے میں موسیقی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جیسے جیسے نوجوان خود مختار ہوتے ہیں وہ زندگی کے شہوانی پہلوؤں (sexual aspects of life) کے متعلق معلومات کے حصول کے لیے موسیقی اور گانوں کا رُخ کرتے ہیں' اور یہ ایسے معاملات ہوتے ہیں جن پر گھر اور اسکول دونوں جگہوں پر ممانعت ہوتی ہے۔''

۱۹۷۱ء میں چھپنے والی ایک تحقیق میں یہ رپورٹ کیا گیا کہ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے مشہور ترین گانوں میں سے تین چوتھائی کا مرکزی موضوع عشق اور جنسی بے راہ روی تھا۔ یہ رجحان بعد کے سالوں میں بدلا نہیں بلکہ بدستور وہی رہا۔ ۱۹۸۶ء میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق ۱۹۸۰ء اور ۱۹۹۰ء کی دہائیوں میں گانوں کے الفاظ اور پیغامات میں جنسی اور عشقیہ رجحان میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔

ان تحقیقات سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ایسی موسیقی سننے کے سامعین پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

انسانی دل کی دھڑکن اور موسیقی کی موزونیت

آہنگ (rhythm) ایک ایسی طبعی قوت ہے جو فطرت نے بہت سے جسمانی افعال میں رکھی ہے'

جیسے دل کی دھڑکن، دوڑنا، سانس لینا وغیرہ۔اس لیے ہمارا جسم فوری طور پر کسی بھی ایسی بیرونی چیز سے متاثر ہوتا ہے جس میں آہنگ کا عنصر موجود ہو۔مثلاً ڈھول کی آواز، روشنیوں کا سحر انگیز طریقے سے بار بار جلنا بجھنا۔یہ بات حیران کن نہیں کہ سب سے زیادہ آرام دہ موسیقی وہ ہوتی ہے جس میں ساز و آواز کی ضرب (beat) ایک منٹ میں ۷۰ سے ۸۰ تک ہوتی ہے، جو کہ دل کی دھڑکن کی فطری رفتار کے مطابق ہے۔موسیقی کی مشہور قسم ''جاز'' (Jazz) کی سب سے اہم خصوصیت دھڑکن کی آواز (Pulsating Rhythm) ہے۔''جاز'' میں ڈھول کی ضرب بھی دل کی دھڑکن کی طرح ایک منٹ میں تقریباً ۷۲ دفعہ ہوتی ہے۔

موسیقی کے اندر انسان کو ہپناٹائز کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ہپناٹزم کی بنیادی خصوصیت تکرار (repetition) ہے اور یہی چیز موسیقی اور گانوں میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔زیادہ دیر تک ایسی تکرار کے زیر اثر رہنے کے اثرات سحر انگیز ہوتے ہیں۔مثلاً طبلے کی تھاپ کو مسلسل سننے سے انسان کے شعور (consciousness) کی حالت میں عارضی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور دماغ ہپناٹزم کی ایسی حالت میں پہنچ جاتا ہے جس میں وہ ہر پیغام کو بغیر ردّ و کد کے قبول کر لیتا ہے (Suggestive Hypnosis)۔ یہی اثرات گھنگھروکی چھن چھن، طنبورے کی آس اور گھنٹی کی ٹن ٹن پیدا کرتے ہیں۔ایسے ہپناٹزم کی حالت میں گانے کے پیغامات سننے والوں کے اذہان پر نقش ہو جاتے ہیں۔آوازیں جن ذرائع سے انسانوں پر اثر انداز ہوتی ہیں، وہ بے شمار ہیں۔آج کی موسیقی کی اونچی آوازیں اور تیز روشنیاں برین واشنگ کا بہترین ذریعہ ہیں۔

مغربی موسیقار لیونارڈ مائیر کے مطابق موسیقی کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ کچھ راگ یا گانے کے مضامین چند تبدیلیوں کے ساتھ دیگر مضامین کے ہمراہ بار بار دہرائے جاتے ہیں، لیکن گانے کے اصل راگ اور بول گانے کے دوران بار بار واپس آتے ہیں جس سے سننے والے کو ایک طرح کی مانوسیت اور آسودگی کا احساس ہوتا ہے۔یہ چیز نہ صرف کلاسیکل موسیقی میں بلکہ لوک موسیقی اور پاپ میوزک میں بھی پائی جاتی ہے۔

کانوں کے راستے دل کی زنگ آلودگی اور تباہی

ہمارے کان سننے کے لیے اسی طرح مرکزی حیثیت رکھتے ہیں جس طرح ہماری آنکھیں دیکھنے کے لیے۔انسانی جسم کے حواسِ خمسہ میں سے سب سے طاقتور سننے اور دیکھنے کے حواس ہوتے ہیں۔اس کے مقابلے میں قوتِ ذائقہ، قوتِ لامسہ اور قوتِ شامہ کی حیثیت ذیلی قسم کی ہوتی ہے اور ان کا انحصار انسان کی قوتِ سماعت اور بصارت سے حاصل شدہ معلومات پر ہوتا ہے۔

ہر قسم کی آوازیں ہم پر اپنا اثر ڈالتی ہیں اور یہ اثر اچھا بھی ہو سکتا ہے اور بُرا بھی۔اسی وجہ سے کانوں

کے راستے بہت آسانی سے دل کی تباہی کا سامان مہیا کیا جا سکتا ہے۔ شیطان کو انسان کی اس کمزوری کا بخوبی علم ہے۔ اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے شیطان کے متعلق فرمایا ہے:

﴿وَاسۡتَفۡزِزۡ مَنِ اسۡتَطَعۡتَ مِنۡهُمۡ بِصَوۡتِكَ ....الخ﴾ (الاسراء: ٦٤)

''تو (یعنی شیطان) انسانوں میں سے جس جس کو اپنی آواز سے پھسلا سکتا ہے' پھسلا لے۔''

شیطان اپنی آواز یعنی موسیقی اور گانے بجانے کے ذریعے انسانوں کو بہکاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے اسلام نے موسیقی کو شیطان کی اذان قرار دیا ہے۔ شیطان انسان کے دل کو کانوں کے راستے خراب کرتا ہے' اور یہ بات اب جدید سائنسی تحقیقات سے ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی دل صرف ایک پمپ نہیں بلکہ عقل وسمجھ رکھنے والا ایک عضو ہے۔

یہ صحیح ہے کہ کانوں کی حفاظت کرنا آنکھوں کی حفاظت سے بھی مشکل کام ہے۔ اسی لیے قرآن میں قوتِ سماعت کا ذکر دیکھنے کی قوت کے ذکر سے پہلے کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ السَّمۡعَ وَالۡبَصَرَ وَالۡفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنۡهُ مَسۡـُٔوۡلًا﴾ (الاسراء)

''یقیناً آنکھ' کان اور دل سب ہی کی باز پرس ہونی ہے۔''

پیدائش کے وقت بچے کی سننے کی صلاحیت مکمل طور پر کام کر رہی ہوتی ہے' جبکہ بچہ ایک خاص فاصلے سے زیادہ کی چیز نہیں پہچان سکتا۔ نومولود بچے کو اس چیز میں کئی ہفتے لگتے ہیں کہ وہ لوگوں کے چہرے پہچان سکے۔ اسی طرح قرآن میں ارشاد ہے:

﴿وَاللّٰهُ اَخۡرَجَكُمۡ مِّنۡۢ بُطُوۡنِ اُمَّهٰتِكُمۡ لَا تَعۡلَمُوۡنَ شَيۡـًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ﴾ (النحل)

''اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔ اس نے تمہیں کان دیے' آنکھیں دیں اور سوچنے والے دل دیے' اس لیے کہ تم شکر گزار بنو۔''

﴿قُلۡ هُوَ الَّذِىۡۤ اَنۡشَاَكُمۡ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمۡعَ وَالۡاَبۡصَارَ وَالۡاَفۡـِٕدَةَ ؕ قَلِيۡلًا مَّا تَشۡكُرُوۡنَ﴾ (الملك)

''ان سے کہو اللہ ہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا' تم کو سننے اور دیکھنے کی طاقتیں دیں اور سوچنے سمجھنے والے دل دیے' مگر تم کم ہی شکر ادا کرتے ہو۔''

ان آیات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ''سننے'' کا ذکر دیکھنے کی صلاحیت سے پہلے ہوا ہے۔ یہ اس لیے بھی ہے کہ رحم مادر میں پہلے قوتِ سماعت نشوونما پاتی ہے اور پھر قوتِ بصارت۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے جدید سائنس نے صرف اسی صدی میں دریافت کیا ہے جبکہ قرآن اسے ۱۴۰۰ سال سے بیان کر رہا ہے۔ اسی طرح یہ عام مشاہدے کی بات ہے کہ بچے اپنی نشوونما کے ابتدائی سالوں میں بہت عرصے تک

صرف سنتے ہیں اور پھر بولنا شروع کرتے ہیں۔مزید برآں' رسول کریم ﷺ اللہ تعالیٰ سے صبح وشام ایک دعا مانگا کرتے تھے جس میں قوت سماعت کا ذکر قوت بصارت سے پہلے فرمایا کرتے۔

((اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَدَنِیْ اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ فِیْ سَمْعِیْ اَللّٰھُمَّ عَافِنِیْ فِیْ بَصَرِیْ لَا اِلٰـہَ اِلَّا اَنْتَ)) [ثلاثـًا] (۱)

''اے اللہ! مجھے تو جسم کی سلامتی عطا فرما۔اے اللہ! مجھے سننے کی سلامتی عطا فرما۔اے اللہ! مجھے دیکھنے کی صلاحیت کی سلامتی عطا فرما۔'' (آپؐ تین بار یہ دعا مانگتے۔)

قوتِ سماعت کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اِس حس کو قرآن میں عقل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

﴿وَقَالُوْا لَوْ کُنَّا نَسْمَعُ اَوْنَعْقِلُ مَا کُنَّا فِیْٓ اَصْحٰبِ السَّعِیْرِ﴾ (الملك)

''اور وہ کہیں گے کاش ہم سنتے یا سمجھتے تو آج اس بھڑکتی ہوئی آگ کے سزاواروں میں نہ شامل ہوتے۔''

اسی طرح قرآن میں دوسری جگہ سننے کی حس کا تعلق سمجھ کے ساتھ بیان ہوا ہے:

﴿رَبَّـنَآ اِنَّـنَا سَمِعْنَا مُنَادِیًا یُّنَادِیْ لِلْاِیْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّکُمْ فَاٰمَنَّا﴾ (آل عمران:۱۹۳)

''اے ہمارے رب! ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا جو ایمان کی طرف بلاتا تھا اور کہتا تھا کہ اپنے رب کو مانو' پس ہم نے اس کی دعوت قبول کر لی۔''

اور انسانی قلب اور کانوں کا تعلق قرآن میں ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَـہٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَھُوَ شَھِیْدٌ﴾ (قٓ)

''یقیناً اس میں عبرت کا سبق ہے ہر اُس شخص کے لیے جو دل رکھتا ہو یا جو توجہ سے بات کو سنے۔''

اگر ہم غور کریں تو دیکھیں گے کہ سننے کی حس چاروں سمتوں میں (یعنی circular) کام کرتی ہے جبکہ آنکھیں صرف سامنے دیکھ سکتی ہیں (یعنی linear)۔ہم کسی بھی سمت سے آنے والی آواز سن سکتے ہیں جبکہ ہم صرف وہی چیز دیکھ سکتے ہیں جو ہماری آنکھوں کے سامنے ہو۔اگر خدا کی نافرمانی کا کوئی کام ہمارے سامنے ہو رہا ہو تو ہم اپنی آنکھیں آسانی سے بند کر سکتے ہیں لیکن اپنے کانوں کی حفاظت کے لیے ہمیں جسمانی طور پر اس جگہ کو چھوڑنا پڑتا ہے۔

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الادب' باب ما یقول اذا اصبح۔ ومسند احمد: ۴۲/۵' ح:۱۹۹۱۷۔ یہ حدیث امام بخاری نے الادب المفرد میں بھی بیان کی ہے۔شیخ عبد العزیز بن بازؒ نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔ (بحوالہ تحفۃ الاخبار' ص۲۶)۔شیخ ناصر الدین البانیؒ نے اسے تمام المنۃ' (ح۲۳۲) میں بیان کیا ہے اور اس کی اسناد کو حسن قرار دیا ہے۔

مزید برآں، انسان کی قوتِ سماعت اندھیرے اور روشنی میں دونوں جگہ کام کر سکتی ہے، جبکہ آنکھیں اندھیرے میں نہیں دیکھ سکتیں۔ مسلمان عرب ماہر نفسیات محمد عثمان نجاتی اپنی کتاب ''قرآن کریم اور علم النفس'' میں لکھتے ہیں کہ انسان کی قوتِ سماعت کو اس کی قوتِ بصارت پر اس لیے بھی فوقیت حاصل ہے کہ سونے کے دوران بھی انسان کے کان بیدار رہتے ہیں، جبکہ نیند میں جاتے ہی انسان کی آنکھیں دیکھنا بند کر دیتی ہیں۔

اس تمام بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ کانوں کو گناہوں سے بچانا آنکھوں کے مقابلے میں زیادہ مشکل ہے۔ موسیقی ہمارے روحانی دل کو کانوں کے ذریعے تباہ کرتی ہے۔ یہ حقیقت کہ دل کی تباہی کا سب سے آسان راستہ کانوں کے ذریعے ہوتا ہے، جدید سائنسی تحقیقات سے بھی سمجھ میں آ سکتی ہے جن کے مطابق جسم میں کانوں تک جانے والی رگیں (Auditory Nerves) سب سے زیادہ غالب ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے کان بہت حساس ہوتے ہیں اور اس کے بہت سے سائنسی شواہد موجود ہیں۔ ہمارا دماغ دائیں اور بائیں حصوں (Right and Left Hemispheres) پر مشتمل ہوتا ہے جو مختلف فرائض انجام دیتے ہیں۔ نتیجتاً ہمارے دو کان موسیقی اور گانے بجانے کو جب سنتے ہیں تو آنے والی آوازوں یا انفارمیشن کو مختلف انداز میں پرکھتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ ہمارے دونوں کان گلوکار کی آواز کے سوز، درد اور گانے کے اشعار کو علیحدہ علیحدہ پرکھتے ہیں۔ یہ چیز پہلی بار ۱۸۷۸ء میں دریافت ہوئی۔ بعد میں اس میدان میں دوہری سماعت (Dichotic Listening) کے تجربات کیے گئے۔ دوہری سماعت کی تحقیقات میں مختلف آوازیں (اس معاملے میں وہ آوازیں موسیقی اور گانے تھے) دونوں کانوں کو علیحدہ علیحدہ ہیڈ فونز کے ذریعے سنائی جاتی ہیں، یعنی ایک کان کو کوئی ایک طرح کی آواز سنائی جاتی جبکہ دوسرے کان کو بالکل دوسری طرز کی کوئی آواز۔ پھر اس چیز کا مطالعہ کر کے کہ کون سا کان کس قسم کی آواز کو زیادہ بہتر طریق پر پرکھ سکتا ہے، محققین یہ بتا سکتے ہیں کہ کون سا کان کس قسم کی موسیقی کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ مثلاً ۱۹۸۲ء میں کی گئی ایک تحقیق کے مطابق عام انسانوں میں بایاں کان گلوکار کی آواز کے سوز اور جذباتی پہلو کی پہچان میں بہتر ہوتا ہے جبکہ دایاں کان گانے کے الفاظ اور اشعار کے اصل پیغام کو پہچاننے میں زیادہ بہتر ہوتا ہے۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے کان اس معاملے میں بہت حساس ہوتے ہیں کہ ان میں جانے والی انفارمیشن کس قسم کی ہے اور بالآخر یہی انفارمیشن ہمارے افعال کو متأثر کرتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، جیسا کہ قرآن اور حدیث سے ہمیں پتا چلتا ہے، کہ موسیقی اور گانا عام طور پر ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ اس میں حیرانگی کی بات نہیں کہ جب موسیقی اور گلوکار کی آواز کو ملایا جاتا ہے تو اس طرح شیطان انسان کے دائیں اور بائیں دونوں کانوں کا استحصال کر کے اس کے دل کو بیمار کر دیتا ہے۔

موسیقی سے کانوں کو پہنچنے والا نقصان

موجودہ زمانے میں سمعی ٹیکنالوجی (Audio Technology) میں تیزی سے ترقی کی وجہ سے ارباب فکر موسیقی سننے سے کانوں کو پہنچنے والے نقصانات کے بارے میں پریشان ہیں۔موسیقی کو جن طریقوں سے لوگوں تک پہنچایا جاتا ہے ان میں آلات موسیقی، روایتی سپیکر، کمپیوٹر اور ہیڈ فونز شامل ہیں۔ گزشتہ تیس سالوں میں پبلک ایڈریس سسٹم کی ایجاد کی بدولت موسیقی کے عوامی پروگراموں (Musical Concerts) میں آواز میں بتدریج اضافہ ہوا ہے۔ پی اے سسٹم دراصل عوامی جگہوں پر آواز میں اضافہ کرنے کا الیکٹرانک سسٹم ہوتا ہے اور یہ لاؤڈ سپیکر، مائیکروفونز، مکسنگ بورڈ، ایمپلی فائر وغیرہ پر مشتمل ہوتا ہے۔اس کا مقصد آواز کو نکھار کر اور بڑھا چڑھا کر سامعین وحاضرین تک پہنچانا ہوتا ہے۔ایک عام پاپ میوزک کنسرٹ میں آواز کی شدت (intensity) تقریباً ۱۴۰ ڈے سی بیل (decibell) ہوتی ہے۔

امریکہ میں سمعی آلودگی (noise pollution) کے خلاف ایک احتجاجی ادارہ Noise-Free America ہے، جس کے مہیا کردہ اعداد وشمار کے مطابق ۱۴۰ سے ۱۵۰ ڈے سی بیل تک اونچی آواز کے میوزیکل کنسرٹ میں موسیقی سننا اس چیز کے برابر ہے کہ انسان بوئنگ 747 ہوائی جہاز کے بالکل پاس کھڑا ہو جبکہ جہاز کے پنکھے پورے زور شور کے ساتھ چل رہے ہوں۔

اونچی آواز میں موسیقی سننے کی وجہ سے قوت سماعت میں کمزوری اور tinnitus (کانوں میں گھنٹی بجنے کی آواز ہر وقت سنائی دینا) جیسی بیماریاں لگ جاتی ہیں۔امریکہ کے شہر لاس اینجلس میں کانوں کی بیماریوں کے ایک ریسرچ سنٹر کے مطابق:

> ''۱۹۶۰ء کی دہائی میں پاپ میوزک اور موسیقی سننے کے نت نئے آلات کی کثرت کے بعد بہت سے امریکی عوام کی قوتِ سماعت کمزور ہونا شروع ہوگئی۔ہم نے اب یہ مشاہدہ کرنا شروع کیا ہے کہ بہت سے موسیقاراور آلاتِ موسیقی پر کام کرنے والے انجینئر حضرات جو عرصے تک اس پیشے سے منسلک رہتے ہیں، انہیں سننے میں مشکلات (hearing problems) پیش آتی ہیں۔''

اِسی طرح کانوں پر ہیڈ فونز لگا کر موسیقی سننے کے بھی اتنے ہی برے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ماہرین علم سماعت (Audiologists) قوتِ سماعت کے نقصان کا ذمہ دار نوجوانوں کے موسیقی سے شدید لگاؤ (بالخصوص ہیڈ فونز) کو ٹھہراتے ہیں۔اونچی آواز میں موسیقی کو کسی بھی ذریعے سے لگا تار سننے سے انسان کی سننے کی صلاحیت مستقل طور پر ناکارہ ہوسکتی ہے۔

ستم بالائے ستم یہ کہ موسیقی اونچی آواز میں سننے کے برے اثرات صرف کانوں تک محدود نہیں ہوتے۔اونچی آوازوں کے غیر سمعی (Non-auditory) اَثرات بھی ہوتے ہیں جو قوت سماعت کو متاثر نہ بھی کریں لیکن آلات کی مدد سے ناپے جاسکتے ہیں۔مثلاً بلڈ پریشر کا بڑھ جانا، بے خوابی، سانس لینے میں

دِقت، دل کی دھڑکن کا بڑھ جانا اور خون کی شریانوں کا سکڑنا وغیرہ ایسے اثرات ہیں جو اونچی آوازوں کو سننے سے پیدا ہوتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کی ایک پیشین گوئی

رسول پاک ﷺ نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا:

((لَيَشْرَبَنَّ نَاسٌ مِّنْ اُمَّتِی الْخَمْرَ يُسَمُّوْنَـهَا بِغَيْرِ اسْمِهَا، يُعْزَفُ عَلٰى رُءُ وْسِهِمْ بِالْمَعَازِفِ وَالْمُغَنِّيَاتِ، يَخْسِفُ اللّٰهُ بِهِمُ الْاَرْضَ وَيَجْعَلُ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ))(۱)

''میری اُمت میں ایسے لوگ ہوں گے جو شراب پئیں گے، اس کو اس کے نام کے علاوہ دوسرے نام سے پکاریں گے۔ ان کے سروں پر موسیقی اور گانے کے آلات ہوں گے اور وہ گانے والیوں کو سنیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کے نیچے سے زمین کو شق کر دیں گے اور ان میں سے بعض کو بندر اور خنزیر بنا دیں گے''۔

گویا آخری زمانے کی علامات میں سے ایک علامت لوگوں کا سروں پر موسیقی کے آلات اٹھائے پھرنا ہے اور آج ہم دیکھتے ہیں کہ لوگوں نے سروں پر موسیقی کے ہیڈ فونز لگا رکھے ہیں، یعنی چودہ سو سال پرانی پیشین گوئی کی آج تصدیق ہو رہی ہے۔

آج کے نوجوان کے لیے میوزک خاص طور پر ہمہ گیر حالت ہے۔ راک میوزک کے اوائل کے دنوں میں ریڈیو بھاری اور حجم میں بڑے ہونے کے باعث بس ایک ہی جگہ رکھے جاتے تھے۔ جب ٹرانسسٹر ریڈیو نکل آئے تو میوزک کو ساتھ لیے پھرنا آسان ہو گیا۔ آلاتِ موسیقی (ہیڈ فونز) کا حجم چھوٹے سے چھوٹا ہوتا جاتا اور ان کی ہلکی اور اعلیٰ ترین بناوٹ نے نوجوانوں کے لیے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو موسیقی میں مسلسل غلطاں رکھیں۔

یہ بات قابل مذمت ہے کہ ہمارے جدید معاشرے نے ایسی تفریحی صنعت گری کی ہے تاکہ لوگ کرۂ ارض پر ہر جگہ موسیقی سے لطف اندوز ہو سکیں۔ چھوٹے آلات موسیقی کے ذریعے سے چلتے پھرتے، کام کرتے، یہاں تک کہ سوتے ہوئے بھی وہ اپنے پسندیدہ میوزک ویڈیوز دیکھ یا سن سکتے ہیں۔ بعض گارمنٹ کمپنیوں نے تو اپنے گاہکوں کے لیے ایک ذاتی سٹیریو اس طرح مہیا کیا ہے کہ jackets کے ٹوپی والے حصے (hoods) میں ریڈیو اور سپیکرز اندر ہی سی دیے گئے ہیں۔

آج دس سے بیس سال کی عمر کے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد موسیقی ہی کے لیے زندہ ہے۔ یہ ان

---

(۱) سنن ابن ماجه، كتاب الفتن، باب العقوبات۔ یہ صحیح حدیث ہے۔ اسے انہی الفاظ سے بیہقی اور ابن عساکر نے بھی روایت کیا ہے۔ علامہ ابوطیب شمس الحق عظیم آبادی کی شرح حدیث میں بیان ہوا ہے کہ علامہ ابن قیمؒ نے اس حدیث کو صحیح قرار دیا ہے۔ شیخ ناصر الدین البانیؒ نے بھی اسے صحیح قرار دیا ہے۔

(باقی صفحہ ۷۳)

بقیہ: انسانی جسم اور ذہن پر موسیقی کے اثرات

کا جنون ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ان کو محظوظ نہیں کرسکتی۔ وہ کسی ایسی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیتے جس کا تعلق موسیقی سے نہ ہو۔ وہ موسیقی کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اپنے سکول کے وقت میں یا جب وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہوتے ہیں' گھروں میں' کاروں میں ہر جگہ موسیقی کے سٹیریوز موجود ہیں۔ موسیقی کی محفلیں ہیں۔ ہر جگہ موسیقی کے چینلز مل جاتے ہیں۔ واک مین کی وجہ سے سفر کے دوران اور کتب خانوں سمیت کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں طلبہ کو میوزک سے بچا کر اور روک کر رکھا جاسکے۔ جب تک ان کے ساتھ واک مین ہے' ان کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ عظیم روایات کا کیا مطالبہ ہے۔ موسیقی کی اس طویل رفاقت کے بعد جب وہ کانوں سے اس کو ہٹائیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہرے ہوچکے ہیں۔

[یہ مضمون ڈاکٹر گوہر مشتاق کی کتاب ''موسیقی: اسلام اور جدید سائنس کی روشنی میں'' (مطبوعہ از انِ سحر پبلی کیشنز' منصورہ' ملتان روڈ' لاہور۔ ۲۰۰۹ء) سے ماخوذ ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر مراجع و مصادر کے حوالہ جات حذف کردیے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیے۔]

اہل السنّت والجماعۃ کون؟[۲]

حافظ نذیر احمد ہاشمی

ماتریدیہ

ابومنصور محمد بن محمد بن محمود (جو امام الہدیٰ اور امام اہل السنّت والجماعت کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں) ماترید (جو بقول زرکلی سمرقند کا ایک محلّہ تھا[۴۳] اور بقول شبلی سمرقند کے نواح میں ایک قصبہ تھا[۴۴]) میں پیدا ہوئے۔ تاریخ پیدائش کسی تاریخ نگار نے نہیں لکھی ہے۔ علومِ متداولہ کی تحصیل محمد بن مقاتل رازی' ابونصر عیاضی اور ابوبکر احمد بن اسحاق جوز جانی سے کی۔ دو واسطوں سے قاضی ابویوسف اور امام محمد بن الحسن الشیبانی کے شاگرد تھے۔[۴۵]

ماتریدی کی تصنیفات

کتاب التوحید' کتاب المقالات' ردّ اوائل الدولة للکعبی' بیان اوھام المعتزلہ' الردّ علی القرامطة' شرح الفقه الاکبر لابی حنیفة' اصول الفقه اور تاویلات القرآن[۴۶].

تصنیفات کی مندرجہ بالا فہرست میں ابوزہرہ نے اپنی کتاب الفرق الاسلامیہ میں درج ذیل کتب کا اضافہ کیا ہے: **کتاب المقالات' کتاب ماخذ الشرائع' کتاب الجدل' کتاب ردّ وعید الفُسّاق للکعبی' کتاب ردّ تھذیب الجدل للکعبی' کتاب الاصول الخمسة لابی محمد الباھلی' ردّ کتاب الامامة لبعض الروافض[۴۷].**

معتزلہ کی تاویلاتِ قرآن کی تردید کے سلسلے میں انہوں نے مؤخر الذکر کتاب ''تاویلات القرآن'' لکھی تھی جو اہل السنّت والجماعت کے نقطۂ نظر سے ایک ایسی کتاب قرار دی گئی جس کی نظیر نہیں ہے۔

علم الکلام کے میدان میں اہل السنّت والجماعت کے ہاں دو ہستیاں بے حد محترم اور قابل قدر ہیں' ان میں سے ایک شافعی مسلک کے عالم ابوالحسن اشعری اور دوسرے حنفی مسلک کے عالم ابومنصور ماتریدی ہیں۔ ان ہر دو کی آراء کے اتباع کو اہل السنّت والجماعت کے علماء نے ہدایت پانے اور فساد و گمراہی سے اپنے عقیدے کو محفوظ کر لینے کا وسیلہ قرار دیا ہے[۴۸]۔

بایں ہمہ ماتریدی نے اشعری کے ان تمام اصول سے (جو اشاعرہ کے مخصوص مسائل کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور جن کا صفحاتِ گزشتہ میں ذکر ہو چکا ہے) سے اختلاف کیا ہے۔ اسی بنا پر ماتریدی کا علم الکلام اشاعرہ کے علم الکلام سے جداگانہ خیال کیا جاتا ہے۔ ابوالحسن اشعری چونکہ فقہی مسلک میں امام شافعی کے پیروکار تھے اس لیے شافعیہ کے ہاں ان کا علم الکلام مسلم ہوا' اور ماتریدی فقہی مسلک میں امام ابوحنیفہ کے پیروکار تھے چنانچہ حنفیہ کے ہاں ان کا علم الکلام اتنا مقبول ہوا کہ قدیم زمانے میں فقہی مسلک اور علم الکلام میں مطابقت لازمی ٹھہری۔

لیکن ماتریدی علم الکلام کو وہ شہرت ومقبولیت حاصل نہ ہو سکی جو اشعری علم الکلام کو نصیب ہوئی۔ حتیٰ کہ وہ بلادِ اسلامیہ جن میں فقہ حنفی کی پیروی کی جاتی تھی وہاں بھی امام اشعری کے علم الکلام کی پیروی کی جاتی رہی۔ جس کا اثر یہ ہوا کہ آج اکثر علماء حنفیہ اشاعرہ ہی کے ہم عقیدہ ہیں' حالانکہ قدیم زمانہ میں کسی حنفی کا اشعری ہونا نہایت تعجب سے دیکھا جاتا تھا۔ علامہ ابن الاثیر نے لکھا ہے:

وهذا مما يستطرف ان يكون حنفي اشعريا(۴۹)

''یہ عجیب بات ہے کہ کوئی شخص حنفی ہو کر اشعری ہو۔''

اس کی وجہ یہ ہے کہ الاشعری اور الماتریدی کا اختلافِ رائے اصولی نہیں بلکہ فروعی تھا' اس لیے اہل السنّت کے تمام طبقے اور مکاتب فکر اشعری علم الکلام کی پیروی میں کوئی مضائقہ اور قباحت نہیں جانتے تھے۔ چنانچہ ابوعذبہ نے لکھا ہے:

> ''اشاعرہ اور ماتریدیہ عقائد اہل السنّت والجماعت میں متفق ہیں۔ بعض مسائل میں ان کے ہاں جو اختلاف ہے وہ کسی عیب یا نقص کا موجب نہیں۔ نیز اس سے کسی کے دینی عقیدے پر حرف گیری بھی نہیں کی جا سکتی کیونکہ یہ اختلاف جزوی اور فروعی نوعیت کا ہے جو کسی لفظ کی تشریح یا مسئلے کی بہتر توجیہہ تک محدود ہے''۔(۵۰)

ان دو جلیل القدر علماء کے درمیان بعض مسائل میں جو فروعی اختلافِ رائے پایا جاتا ہے اس کے بارے میں علماء نے مستقل کتابیں لکھی ہیں جن میں سب سے بہترین کتاب ابوعذبہ الحسن بن عبدالمحسن کی تصنیف ''**الروضة البهية فيما وقع بين الاشاعره والماتريدية**'' ہے' جس کے حوالے زیر بحث مضمون میں بکثرت دیے گئے ہیں۔

ان دونوں علماء کے درمیان جو اختلافی مسائل ہیں ان کی تعداد بعض نے پچاس' بعض نے چالیس' بعض نے تیرہ اور بعض نے صرف تین بتائی ہے۔ علامہ شبلی نے اپنی کتاب ''علم الکلام'' میں ان مسائل کی تعداد نو ذکر کی ہے جو کہ درج ذیل ہے۔ ماتریدی کے وہ مسائل جن میں وہ امام اشعری کے مخالف ہیں:

(۱) اشیاء کا حسن وقبح عقلی ہے۔

(۲) اللہ کسی کو تکلیف مالا یطاق نہیں دیتا۔

(۳) اللہ ظلم نہیں کرتا اور اس کا ظالم ہونا عقلاً محال ہے۔

(۴) اللہ کے تمام افعال مصالح پر مبنی ہیں۔

(۵) انسان کو اپنے افعال پر قدرت واختیار حاصل ہے اور یہ قدرت ان افعال کے وجود میں اثر رکھتی ہے۔

(۶) ایمان کم اور زیادہ نہیں ہوتا۔

(۷) زندگی سے نا اُمیدی کی حالت میں بھی توبہ قبول ہے۔

(۸) حواسِ خمسہ سے کسی چیز کو محسوس کرنا علم نہیں ہے بلکہ ذریعہ علم ہے۔

(۹) اعراض کا اعادہ نہیں ہوسکتا۔[۵۱]

اگرچہ اکثر علماء کے خیال میں اشاعرہ اور ماتریدیہ کے نظریات میں کوئی اساسی اختلاف نہیں پایا جاتا مگر امام ماتریدی کے اقوال وآراء اور امام اشعری کے اقوال وآراء کا دقیق مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے کہ دونوں کا طرزِ فکر ونظر جداگانہ نوعیت کا ہے۔ تاہم اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ دونوں قرآن مجید کے ثابت کردہ عقائد کو عقل وبرہان کی روشنی میں ثابت کرنا چاہتے تھے' عقائد قرآن کے دائرہ سے نکلنا دونوں کو گوارا نہ تھا' البتہ ایک فریق (ماتریدیہ) پر نسبتاً عقلیت کا غلبہ زیادہ تھا اگرچہ اغراق و مبالغہ سے پاک تھا۔ مثلاً اشاعرہ کہتے ہیں کہ اللہ کی معرفت حاصل کرنا شریعت کی بنا پر واجب ہے' جبکہ ماتریدیہ امام ابوحنیفہ کی اتباع میں یہ کہتے ہیں کہ اس کا وجوب عقلی ہے۔

نیز اشاعرہ کے نزدیک امر شارع کے بغیر اشیاء میں سرے سے کوئی حسن ذاتی نہیں پایا جاتا جس کا فہم وادراک عقل انسانی بھی کر سکے۔ جبکہ ماتریدیہ کی رائے میں اشیاء میں حسن وقبح ذاتی موجود ہے اور وہ مدرک بالعقل بھی ہے۔

میری رائے میں جن جوہری مسائل میں کوئی نص وارد نہیں ہوئی ان میں ماتریدیہ کا نقطۂ نگاہ عقل و نقل کا حسین مرکب نظر آتا ہے۔ اس لیے اگر ماتریدیہ کے افکار کا مختصر مطالعہ کیا جائے تو ماتریدیہ اور اشاعرہ کے درمیان محل نزاع ومحل اتفاق کی نشاندہی میں قاری کے لیے آسانی ہوجائے گی۔

ماتریدیہ کے افکار

(۱) عقل معرفت خداوندی کے وجوب کا ادراک کرسکتی ہے

چنانچہ اللہ تعالیٰ نے متعدد آیات بینات میں انسانوں کو کائنات میں تفکر وتدبر کی تلقین فرمائی ہے۔ اگر عقل جادۂ مستقیم پر گامزن رہ کر تقلید وضلالت سے پاک ہے تو اس کے ذریعے ایمان ومعرفت کا حصول

ممکن ہے۔فکر ونظر کو ترک کرنے کا مطلب احکام قرآنی کو مہمل چھوڑنا ہے' کیونکہ عقل کو معرفت خداوندی کا ذریعہ قرار نہ دینے سے ان نتائج وفوائد کا معطّل ہونا لازم آئے گا جو اللہ نے فکر ونظر پر مرتب کیے تھے۔اگرچہ ماتریدی کے نزدیک عقل معرفت خداوندی کے حصول میں آزاد ہے تاہم مستقلاً اس سے شرعی احکام کی معرفت حاصل نہیں ہوسکتی۔امام ابوحنیفہ کی بھی یہی رائے ہے۔

معتزلہ کا نقطۂ نگاہ بھی اس کے قریب قریب ہے۔البتہ دونوں کے نظریات میں بڑا نازک فرق پایا جاتا ہے' اور وہ یہ کہ معتزلہ کے نزدیک معرفت خداوندی کی تحصیل عقل کی رو سے واجب ہے' ماتریدیہ اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ عقل معرفت خداوندی کے وجوب کا ادراک کرسکتی ہے مگر واجب کرنے والی اللہ کی ذات ہے۔

(۲) عقل اشیاء کے حسن وقبح کا ادراک کرسکتی ہے

ماتریدیہ کا موقف یہ ہے کہ اشیاء کا حسن وقبح ذاتی ہوتا ہے اور عقل اس کا ادراک کرسکتی ہے۔ان کے نزدیک اشیاء کی تین قسمیں ہیں:

(۱) وہ اشیاء جن کے حسن کا ادراک عقل انسانی کرسکتی ہے۔

(۲) وہ اشیاء جن کے حسن وقبح کا ادراک عقل کے ذریعے نہیں بلکہ شارع سے معلوم کیا جاتا ہے۔

(۳) وہ اشیاء جن کے قبح کا ادراک بربنائے عقل ممکن ہے۔

معتزلہ بھی اسی قسم کی تقسیم کرتے ہیں' جیسا کہ شیخ ابوعلی جبائی کا قول ہے جو امام ابوالحسن اشعری نے اپنی کتاب ''مقالات الاسلامیین'' میں نقل کیا۔اس کا ترجمہ ملاحظہ فرمائیے:

> ''ہر وہ معصیت جس کے متعلق عقل یہ سمجھتی ہے کہ اللہ کو اس کا امر کرنا چاہیے لیکن اگر اللہ نے اس سے منع کر دیا ہو تو وہ نہی الٰہی کی وجہ سے قبیح قرار پائے گی' لیکن جس گناہ کے بارے میں عقل کا بھی فیصلہ یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت نہیں دے سکتا تو سمجھنا چاہیے کہ وہ گناہ بذاتِ خود قبیح ہے' جیسے ذاتِ خداوندی کو نہ جاننا اور اس کے برعکس عقیدہ رکھنا۔بعینہٖ اسی طرح اگر اللہ نے امر کر دیا ہے تو وہ حکم الٰہی کے باعث حسن ہو جائے گا اگرچہ عقلاً اس کو ممنوع ہونا چاہیے۔اور جو احکام ہوں ہی ایسے کہ ان کا حکم دینا اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری تھا وہ بذاتِ خود حسن ٹھہریں گے۔'' (۵۲)

اور شہرستانی نے لکھا ہے کہ معتزلہ اشیاء کے حسن وقبح کا فیصلہ ازروئے عقل کیا کرتے تھے۔چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ''سب معارف (عقائدی مسائل) عقل سے سمجھے جاسکتے ہیں اور واجب ہے کہ عقل ہی سے ان میں غور کیا جائے' مثلاً وحی کے وارد ہونے سے پہلے ہی معلوم تھا کہ محسن کا شکر ادا کرنا ضروری ہے۔ حسن اور قبح حسن اور قبیح کی دو ذاتی صفات ہیں''۔(۵۳)

معتزلہ اور ماتریدیہ دونوں کی تقسیم میں نقطۂ امتیاز یہ ہے کہ معتزلہ کے نزدیک جو چیز عقلاً حسن ہو وہ واجب الفعل ہوتی ہے، مگر ماتریدیہ اس حد تک نہیں جاتے بلکہ امام ابوحنیفہ کی اتباع میں یہ کہتے ہیں کہ اگرچہ عقلاً اشیاء کے حسن وقبح کا ادراک ممکن ہے مگر بندہ اس وقت تک مکلّف و مامور نہیں ہوتا جب تک شارع حکم نہ دے، اس لیے کہ عقل بالاستقلال دینی احکام صادر نہیں کر سکتی بلکہ ان کا صادر کرنا باری تعالیٰ ہی کا کام ہے۔

اشعری ماتریدیہ کے اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ اشیاء کے ذاتی حسن وقبح کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے نزدیک حسن وقبح کا معیار و مدار شارع کے اوامر و نواہی ہیں۔ بقول اشاعرہ کوئی کام حسن اس لیے ہے کہ وہ شرعاً مامور بہ ہے اور قبیح اس لیے ہے کہ وہ شرعاً منہی منہ ہے۔

اکثر لوگوں کا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ مذکورہ بالا مسئلے میں اشاعرہ کے عقائد گو دلائل عقلی کے لحاظ سے مضبوط نہ ہوں لیکن اکابر سلف کے یہی عقائد تھے، چنانچہ بقول ان کے قرونِ اولیٰ میں لوگ حسن وقبح عقلی کے قائل نہ تھے اور اس بنا پر احکام شرعی کا مصالح عقلی پر مبنی ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔

اس غلط خیال کا پردہ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے چاک کیا ہے۔ وہ اگرچہ نہایت متعصب، متقشف اور فلسفہ کے سخت دشمن تھے، تاہم چونکہ تقلید کے پابند نہ تھے اور حق و باطل کی تمیز رکھتے تھے، لہٰذا انصاف سے اپنی رائے بیان کرتے ہوئے اپنی کتاب ''کتاب الردّ علی المنطقیین'' میں اس پر مفصل بحث کی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:

> **اکثر الطوائف علی اثبات الحسن والقبح العقلیین، لکن لا یثبتونه کما یثبته نفاة القدر من المعتزلة وغیرهم بل القائلون بالتحسین والتقبیح من اهل السنة والجماعة من السلف والخلف .... وهذا قول الحنفیة، ونقلوه عن ابی حنیفة نفسه. وهو قول کثیر من المالکیة، والشافعیة، والحنبلیة کابی الحسن التمیمی، وأبی الخطاب، وغیرهما من اصحاب احمد وکابی علی ابن ابی هریرة وابی بکر القفال الشاشی، وغیرهما من الشافعیة، وکذٰلک من اصحاب مالک، وکذٰلک اهل الحدیث کابی نظر السجزی، وابی القاسم سعد بن علی الزنجانی وغیرهما. بل هؤلاء ذکروا ان نفی ذٰلک هو من البدع التی حدثت فی زمن ابی الحسن الاشعری لما ناظر المعتزلة فی القدر ...... والا فنفی الحسن والقبح العقلیین مطلقاً لَمْ یقله به احد من سلف الامة ولائمتها...... بل ما یؤخذ من کلام الائمة والسلف فی تعلیل الاحکام، وبیان حکمة اللّٰه فی امره وخلقه، وبیان ما امر اللّٰه به من الحسن الذی یعلم بالعقل وما فی مناهیه من القبح المعلوم بالعقل، ینافی قول النفاة. والنفاة لیس لهم حجة علی الیفی اصلاً وقد استقصی ابوالحسن الآمدی ما ذکروه من الحجج وبین انها عامتها فاسدة.** (۵۴)

''اور اکثر مذہبی فرقوں کا حسن و قبح عقلی کے اثبات پر اتفاق ہے لیکن وہ اس کا اس طریقے سے اثبات نہیں کرتے جیسا کہ قدریہ میں سے فرقہ معتزلہ کرتا ہے۔ بلکہ اہل السنّت والجماعت کے سلف وخلف تحسین و تقبیح عقلی کے اثبات میں معتزلہ کے مخالف ہیں۔اور یہی حنفیہ کا قول ہے بلکہ انہوں نے یہ قول بذات خود امام ابوحنیفہ سے بھی نقل کیا ہے اور اسی کے اکثر شافعیہ' مالکیہ اور حنبلیہ قائل ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل کے اصحاب میں سے ابوالحسن التمیمی اور ابوالخطاب وغیرہ اور شافعیہ میں سے ابوعلی بن ابی ہریرہ اور ابوبکر قفال شاشی وغیرہ اور اہل الحدیث میں سے ابونصر السنجری اور ابوالقاسم سعد بن علی الزنجانی وغیرہ' اسی طرح مالکیہ میں سے اکثر علماء تحسین و تقبیح عقلی کے قائل ہیں۔ بلکہ مذکورہ بالا علماء کا تو یہ قول ہے کہ حسن و قبح عقلی کا انکار منجملہ ان بدعات کے ہے جو اسلام میں ابوالحسن اشعری کے زمانے میں پیدا ہوئیں جبکہ انہوں نے معتزلہ سے مسئلہ قدر کے بارے میں مناظرہ کیا تھا ورنہ حسن و قبح عقلی کی مطلقاً نفی کا اسلافِ اُمت میں سے کوئی بھی قائل نہیں ہوا ہے۔ کیونکہ تعلیل احکام کے سلسلے میں ائمہ سلف کے کلام اور اللہ عزوجل کے امر و خلق کا حکمت سے متعلق ہونے نیز عقلاً حسن کے بارے میں اللہ کے امر اور عقلاً قبیح کے بارے میں اللہ کی نہی سے بھی حسن و قبح عقلی کے منکرین کے قول کی تردید ہوتی ہے۔ منکرین کے پاس اپنے مسلک کے ثبوت کے لیے کوئی دلیل نہیں۔ اگرچہ ابوالحسن آمدی نے ان کے لیے دلائل اکٹھا کرنے میں ایڑی چوٹی کا زیر لگایا ہے' لیکن بالآخر ان کو بھی یہ لکھنا پڑا: **انها عامتها فاسدة**۔''

آگے چل کر مزید لکھتے ہیں:

والحسن والقبح من افعال العباد يرجع الى كون الافعال نافعة لهم وضارة لهم' وهذا مما لا ريب فيه انه يعرف بالفعل' ولهذا اختار الرازى فى آخر امره ان الحسن والقبح العقليين ثابتان فى افعال العباد(۵۵)

''بندوں کے افعال میں حسن و قبح کا معنی یہ ہے کہ جو افعال ان کے لیے نافع و مفید ہیں وہ حسن اور جو ضرر رساں ہیں وہ قبیح ہوں گے' اور یہ چیز بلاشبہ عقل سے معلوم کی جا سکتی ہے' اسی لیے تو امام رازی کو بھی بالآخر یہ کہنا پڑا کہ افعالِ عباد میں حسن و قبح عقلی ثابت ہے''۔

(نوٹ) علامہ ابن القیم نے اپنی کتاب ''مفتاح دار السعادۃ'' میں اس مسئلہ پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے۔ حسن و قبح عقلی کے منکرین کے تمام دلائل ذکر کرنے کے بعد تقریباً ساٹھ وجوہات سے ان کا ابطال کیا ہے۔(۵۶)

علامہ شوکانی نے لکھا ہے:

فالكلام فى هذا البحث يطول وانكار مجرد ادراک العقل لكون الفعل حسنًا او قبيحًا مكابرة ومباهنة(۵۷)

''اس مسئلہ میں بحث طویل ہے لیکن کسی شے کے حسن اور قبح کا عقل کے ذریعے ادراک کرنے کا انکار بغض وعناد اور حق کا انکار ہے۔''

(۳) افعالِ خداوندی کا معلّل بالعِلل ہونا

مندرجہ بالا مسئلہ میں بھی ماتریدی مسلک ومنہاج اشاعرہ ومعتزلہ سے متمیز ہو جاتا ہے اور وہ مسئلہ اللہ تعالیٰ کے افعال کا معلل بالعلل ہونے کا ہے۔ اشاعرہ کی رائے میں اللہ عزوجل کے افعال معلل بالعلل نہیں ہوتے' کیونکہ وہ کسی کے سامنے مسئول وجوابدہ نہیں۔ نیز اس سے ارادۂ باری تعالیٰ کا مقید ومحدود ہونا لازم آتا ہے' حالانکہ اللہ عزوجل جمیع اشیاء کا خالق اور سب پر فائق ہے۔ بخلاف ازیں معتزلہ کے نزدیک افعالِ خداوندی معلل بالمقاصد والاغراض ہوتے ہیں' اور دلیل یہ کہ وہ حکیم ہے کوئی کام ظن وتخمین کی بنا پر نہیں کرتا بلکہ اس نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کیا ہے ﴿قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا﴾۔ پھر معتزلہ اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ صلاح واصلح پر عمل کرنا اللہ پر واجب ہے' کیونکہ جب اشیاء کا حسن وقبح ذاتی ہے اور اللہ عزوجل وہی کام کرتے ہیں جو قرین حکمت ومصلحت ہوتا ہے' لہٰذا یہ محال ہے کہ وہ غیر صالح فعل کا حکم صادر کرے اور صالح کام سے روک دے' پس معلوم ہوا کہ صلاح واصلاح اللہ عزوجل پر واجب ہے۔

ماتریدیہ کا نقطۂ نظر معتزلہ واشاعرہ سے مختلف ہے۔ ان کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ عبث سے منزہ ہے' اس کے افعال بتقاضائے حکمت ومصلحت صادر ہوتے ہیں' کیونکہ وہ حسب بیان خود حکیم وعلیم ہے اور اس نے احکامِ تکلیفیہ وتکوینیہ میں حکمت ومصلحت کو ملحوظ رکھا ہے' مگر اللہ عزوجل حکمت ومصلحت کا قصد وارادہ کرنے والا ہے' لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ اس پر صلاح واصلح کا انجام دینا واجب ہے' کیونکہ اس کا وجوب اختیار وارادہ کے منافی ہے اور اس سے لازم آتا ہے کہ اس پر کسی کا حق واجب الادا ہے حالانکہ وہ بندوں پر فائق ہے اور اس سے کسی فعل کی باز پرس نہیں کی جا سکتی ﴿لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ﴾ اور اگر اس پر کسی کام کو واجب ٹھہرایا جائے تو اس کا اقتضاء یہ ہے کہ وہ بندوں کے آگے مسئول وجوابدہ ہے۔ **(تعالٰی اللّٰہ عن ذٰلک علوًّا کبیرًا)**.

حق بات یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں معتزلہ وماتریدیہ کا اختلاف اساسی نوعیت کا نہیں بلکہ تعبیر وبیان کا اختلاف ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ افعالِ خداوندی بتقاضائے حکمت ومصلحت صادر ہوتے ہیں اور عبث نہیں ہوتے۔ معتزلہ اسے وجوب سے تعبیر کرتے ہیں' ماتریدیہ کے نزدیک اظہار وبیان کا یہ طریقہ محل استبعاد ہے' کیونکہ وجوب کا تقاضا ہے کہ حکم عمل سے سابق ہو' حالانکہ فعل کے مطابق حکمت ہونے کا حکم وقوعِ فعل کے بعد صادر کیا جاتا ہے نہ کہ وقوع سے پہلے۔

جہاں تک معتزلہ واشاعرہ کے باہمی اختلاف کا تعلق ہے تو وہ جوہری واساسی ہے اور اس اختلاف کا مبنیٰ یہ ہے کہ اشیاء میں حسن وقبح ذاتی ہوتا ہے یا غیر ذاتی؟

علامہ ابن تیمیہ نے اشاعرہ کے اس مسلک کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے:

وکذٰلک غلط من غلط من المتکلمین وادعی ان اللّٰہ لم یخلق شیئًا بسببٍ ولا حکمة ولا خص شیئًا من الاجسام بقوی وطبائع وادعی ان کل ما یحدث فان الفاعل المختار بلا تخصیص بحدثه وانکر ما فی المخلوقات للّٰہ وما فی شرعه من الحکم التی خلق وامر لاجلها فان غلط ھٰؤلاء مما سلّط ھٰـؤلاء المتفلسفة وظنوا ان ما یقوله ھـؤلاء وامثالھم ھو دین المسلمین وقول الرسول ﷺ واصحابه(۵۸)

''اسی طرح متکلمین کی یہ بھی غلطی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے کسی چیز کو کسی سبب اور کسی حکمت سے نہیں پیدا کیا' اور یہ کہ اجسام میں اللہ نے حاجتیں اور خاص قوتیں نہیں رکھی ہیں' اور یہ کہ جو چیز پیدا ہوتی ہے فاعل مختار اس کو بلا کسی تخصیص کے خود پیدا کر دیتا ہے' اور یہ کہ اللہ کی مخلوقات میں اور شریعت میں خاص مصالح اور حکمتیں ملحوظ نہیں جن کی وجہ سے وہ اشیاء پیدا کی گئیں یا ان احکام کا حکم دیا گیا ہے۔ متکلمین کی ان غلطیوں نے دعویدارانِ فلسفہ کو قوت اور غلبہ بخشا ہے اور وہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ یہ متکلمین کہتے ہیں وہ مسلمانوں کا دین اور رسول اللہ ﷺ کا ارشادِ مبارک اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا قول ہے۔''

ماتریدیہ کے مسلک (کہ اللہ عزوجل کے اوامر ونواہی اور اس کے تمام افعال گہرے مصالح اور حکمت پر مبنی ہوتے ہیں) کو علامہ ابن تیمیہؒ نے سلف کا مسلک قرار دیتے ہوئے لکھا ہے:

''اصحابِ ابی حنیفہ' مالک' شافعی' احمد اور متکلمین کا ایک گروہ بھی یہی عقیدہ رکھتا ہے۔''

اور معتزلہ کے مسلک کے بارے میں علامہ موصوف لکھتے ہیں:

''معتزلہ اللہ عزوجل کے افعال کو بھی بندوں کے پیمانۂ حسن وقبح سے ناپتے ہیں' چنانچہ جو امور بندوں پر واجب ہیں انہیں اللہ تعالیٰ پر واجب ٹھہراتے اور بندوں کے محرمات کو اللہ پر بھی حرام قرار دیتے ہیں اور اپنی ناقص عقل کے باوجود اس کا نام عدل وحکمت رکھتے ہیں۔ معتزلہ نہ اللہ کے لیے مشیت عامہ کا اثبات کرتے ہیں اور نہ قدرتِ تامہ کا۔ وہ اللہ کو جملہ اشیاء پر قادر بھی نہیں مانتے اور نہ یہ کہتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا۔'' (۵۹)

اور اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ''**منھاج السنة النبویة فی نقض کلام الشیعة والقدریة**'' میں مذکورہ بالا مسئلہ کے بارے میں اشاعرہ کے مسلک کی تردید اور ماتریدیہ کے قول کی تائید کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

واما ما نقله من نفی الغرض الذی ھو الحکمة وکون اللّٰہ لا یفعل لمصلحة العباد فقد قدمنا ان ھذا قول قلیل منھم کالاشعری وطائفة توافقھم ...... وجمھور اھل السنة یثبتون الحکمة فی افعال اللّٰہ تعالی وانه یفعل لنفع عباده ومصلحتھم ولکن

لا يقولون بما تقوله المعتزلة ومن وافقهم بان ما حسن من خلقه حسن منه وما قبح من خلقه قبح منه فلا هذا ولا هذا. واما لفظ الغرض فتطلقه المعتزلة وبعض المنتسبين لاهل السنة ويقولون انه يفعل لغرض اى حكمة وكثير من اهل السنة يقولون لحكمة ولا يطلقون لفظ الغرض[٦٠]

''بہرحال رافضی نے جو یہ نقل کیا ہے کہ اللہ عزوجل کے کام مبنی بر حکمت نہیں ہوتے اور اللہ عزوجل اپنے بندوں کے مصالح کی رعایت نہیں کرتا' تو جیسا کہ ہم قبل ازیں لکھ چکے ہیں کہ یہ عقیدہ اہل السنّت میں سے صرف امام اشعری اور ان کے پیروکاروں کا ہے۔ رہے جمہور اہل السنّت تو وہ اللہ عزوجل کے افعال کے مبنی بر حکمت ہونے اور اپنے بندوں کے مصالح کی رعیت کرنے کے قائل ہیں۔ البتہ جمہور اہل السنّت کا مسلک معتزلہ کے مسلک کی طرح نہیں کہ جو کہتے ہیں ''جو شے مخلوق کے لیے حسن وہ اللہ کے لیے بھی حسن اور جو مخلوق کے لیے قبیح وہ اللہ کے لیے بھی قبیح'' بلکہ ان کا مسلک نہ اشاعرہ کی طرح اور نہ معتزلہ کی طرح ہے۔ رہا لفظ ''غرض'' تو معتزلہ اور بعض نام نہاد اہل السنّت اس کا استعمال حکمت کے لیے کرتے ہیں جبکہ جمہور اہل السنّت لفظ ''غرض'' کی بجائے لفظ حکمت کا استعمال کرتے ہیں۔''

جبر واختیار کا مسئلہ

متکلمین اسلام کے اس بارے میں دو مشہور مذہب ہیں جو قدریہ اور جبریہ کہلاتے ہیں۔ یہاں ان کے مذاہب کا خلاصہ پیش خدمت ہے:

مذهب قدر : معتزلہ کا اعتقاد یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو پیدا کیا اور اس کو افعال پر قدرت بخشی[٦١] اور نیکی و بدی کا اختیار اس کو تفویض کر دیا۔ اب وہ خود اپنی قدرت کے مطابق اور اپنی مشیت کے موافق استقلال کے ساتھ اچھے اور برے افعال کرتا ہے اور اپنے اس اختیار کی بنا پر دنیا میں مدح وذم اور آخرت میں ثواب وعذاب کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ کی طرف سے نہ اس کو کفر ومعصیت پر مجبور کیا گیا ہے اور نہ ایمان و طاعت پر۔ بلکہ وہ رسولوں کو بھیجتا ہے' ان پر کتابیں نازل کرتا ہے' نیکی کا حکم دیتا اور بدی سے منع کرتا ہے' صحیح اور غلط' حق اور باطل کو واضح کر کے ان کو خبردار کر دیتا ہے کہ اگر سیدھا راستہ اختیار کرو گے تو نجات پاؤ گے اور غلط راستہ پر چلو گے تو اس کا برا نتیجہ دیکھو گے۔

چنانچہ اس فرقہ کے سربراہ واصل بن عطاء کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ حکیم وعادل ہے' اس کی طرف شر اور ظلم کی نسبت جائز نہیں ہے' اور نہ یہ جائز ہے کہ اللہ نے خود ہی اپنے بندوں کو جن اوامر ونواہی سے مکلف کیا ہے ان کے خلاف اعمال کے صدور کا وہ خود ارادہ کرے' اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ بندوں کو کسی ایسے فعل پر سزا دے جس کا ارتکاب انہوں نے اس کے حکم ہی سے کیا ہے' لہٰذا بندہ ہی فاعل خیر وشر ہے اور وہی ایمان و

کفر اور اطاعت و معصیت کو اختیار کرتا ہے۔

ابراہیم بن سیار النظام نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ اللہ صرف خیر پر قدرت رکھتا ہے‘ شر اور معاصی اس کی قدرت سے خارج ہیں۔ معمر بن عباد اور ہشام بن عمرو نے اور زیادہ شدت اختیار کر کے ’’وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ‘‘ کا اعتقاد رکھنے والے کو کافر اور گمراہ قرار دیا ہے‘ کیونکہ یہ اعتقاد ان کے نزدیک باری تعالیٰ کی تنزیہہ کے خلاف ہے اور اس کی رو سے اللہ تعالیٰ کو ظالم ماننا پڑتا ہے۔ ان کے بعد جاحظ‘ خیاط‘ کعبی‘ جبائی‘ قاضی عبد الجبار وغیرہ بڑے بڑے معتزلہ نے پوری شد و مد سے یہ حکم لگایا ہے کہ بندوں کے افعال کا خالق اللہ نہیں بلکہ خود بندے ہیں اور خدا کے لیے تکلیف مالایطاق جائز نہیں۔ اور وہ بطور دلیل جن آیاتِ قرآنیہ کو پیش کرتے ہیں ان میں سے چند اہم درج ذیل ہیں:

(۱) ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ﴾ (المؤمن:۱۷)

(۲) ﴿اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (الجاثیة)

(۳) ﴿هَلْ تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ﴾ (النمل)

(۴) ﴿كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ﴾ (الطور)

(۵) ﴿مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ﴾ (النساء:۱۲۳)

(۶) ﴿فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ﴾ (الکهف:۲۹)

(۷) ﴿فَمَنْ شَاءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا﴾ (المزمل)

(۸) ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِى النَّاسِ﴾ (الروم:۴۱)

(۹) ﴿وَمَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ﴾ (الشوریٰ:۳۰)

(۱۰) ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْئًا وَّلٰكِنَّ النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ﴾ (یونس)

(۱۱) ﴿وَمَا كُنَّا مُهْلِكِى الْقُرٰٓى اِلَّا وَاَهْلُهَا ظٰلِمُوْنَ﴾ (القصص)

یہ اور ان کے علاوہ دیگر بے شمار آیاتِ بینات کو اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے معتزلہ پیش کرتے ہیں۔

مذھب جبر: جبریہ کا اعتقاد ہے کہ کوئی چیز اللہ کے ارادے کے بغیر وجود میں نہیں آتی[۶۲] چاہے وہ اشیاء کی ذوات یا ان کی صفات ہوں۔ ان کا اعتقاد ہے کہ کائنات میں ہر ذرے کی حرکت قضا و قدر کے تحت واقع ہوتی ہے‘ وجود اور ایجاد میں اللہ کے سوا کوئی چیز تاثیر نہیں رکھتی‘ خلق اور ابداع میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں۔ جو اللہ چاہتا ہے وہی ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا وہ نہیں ہوتا‘ کوئی شے اس کے حکم اور اس کی قضا کے خلاف بال برابر حرکت نہیں کر سکتی۔ اس کے افعال پر حسن و قبح کا حکم لگانا عقل کے امکان میں نہیں‘ اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے بہتر ہی ہوتا ہے۔ دنیا میں جو حوادث اسباب کے تحت صادر ہوتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں وہ محض ظاہر کے لحاظ سے ہیں‘ ورنہ حقیقتاً سب کا صدور اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے اور

تمام ارضی وسماوی حوادث کا فاعل حقیقی وہی ہے۔

اس بنیادی عقیدے سے متعدد فروعی اعتقادات نکلے ہیں۔جہم بن صفوان اور شیبان بن مسلمہ خارجی کا مذہب یہ ہے کہ انسان اپنے افعال میں مجبورِ محض ہے' نہ وہ ارادہ رکھتا ہے اور نہ اختیار۔ اللہ تعالیٰ جس طرح جمادات' نباتات اور دوسری چیزوں میں افعال پیدا کرتا ہے اسی طرح انسان میں بھی پیدا کرتا ہے۔ انسان کی طرف افعال کی نسبت مجازی ہے۔ رہا ثواب وعتاب تو جس طرح افعال جبری ہیں اسی طرح جزا و سزا بھی جبری ہے۔ یہ خالص جبریت ہے جو معتزلہ کی خالص قدریت کے مقابلہ میں ہے۔جبکہ حسین بن النجار' بشر بن غیاث المریسی' ضرار بن عمرو' حفص الفرد' شعیب بن محمد الخارجی اور عبداللہ بن اباض بانی فرقہ اباضیہ خدا کو انسان کے اچھے برے اعمال کا خالق تو قرار دیتی ہے مگر ان کی رائے میں بندوں کو ایک طرح کی قدرت وارادہ حادثہ بھی حاصل ہے' جس کا کچھ نہ کچھ حصہ ان کے افعال کے صدور میں ضرور ہے' اس کا نام انہوں نے کسب رکھا ہے۔ اسی کسب کی وجہ سے انسان کو امر و نہی کے احکام دیے گئے ہیں اور اسی کے لحاظ سے آدمی عذاب وثواب کا مستحق ہوتا ہے۔

مسئلہ زیر بحث میں جبریہ کے مستدلات:

(۱) ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ﴾ (الصّٰفّٰت)

(۲) ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا فِىْ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا﴾ (الحدید:۲۲)

(۳) ﴿وَمَا اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۱۶۶)

(۴) ﴿وَاِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّقُوْلُوْا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ (النساء:۷۸)

(۵) ﴿وَمَا تَشَاءُوْنَ اِلَّا اَنْ يَّشَاءَ اللّٰهُ﴾ (الدھر:۳۰)

(۶) ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا وَّيَهْدِىْ بِهٖ كَثِيْرًا﴾ (البقرۃ:۲۶)

(۷) ﴿مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يُضْلِلْهُ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ﴾ (الانعام)

(۸) ﴿اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا﴾ (النساء)

(۹) ﴿وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلُوْا وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ﴾ (البقرۃ)

(۱۰) ﴿وَلَوْ شَاءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِى الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ◆ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (یونس:۱۰۰)

اشاعرہ کا نقطۂ نظر

امام ابوالحسن اشعری نے کسب کو تو تسلیم کیا ہے اور انسان کے لیے قدرتِ حادثہ بھی ثابت کی ہے مگر اس قدرت کی تاثیر کے منکر ہیں۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ اپنے بندے سے جس فعل کے صدور کا ارادہ کرتا ہے وہ بندہ کی قدرتِ حادثہ کے تحت صادر ہو جاتا ہے' لیکن یہ قدرت محض ایک آلہ ہے ارادۂ الٰہی کے فعل میں آنے کا' ورنہ حقیقتاً خود اس قدرت میں کوئی تاثیر نہیں جو فعل کے وجود میں آنے کی علت ہو۔

قاضی ابوبکر باقلانی نے اس سے تھوڑا سا اختلاف کیا ہے۔ ان کی رائے میں انسان کے ہر فعل کے دو پہلو ہیں۔ ایک پہلو اس کے نفس فعل ہونے کا ہے' بلا اعتبارِ حسن و قبح و خیر و شر۔ اور دوسرا پہلو اس کے طاعت و معصیت ہونے کا ہے۔ ان میں سے پہلا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا' کیونکہ وہ اس کی قدرت سے ظہور میں آتا ہے اور دوسرا رُخ بندہ کی طرف' کیونکہ اسی پہلو سے ایک فعل بندے کی قدرتِ حادثہ کے تحت رونما ہوتا ہے اور اسی پر جزا و سزا کا ترتب ہوتا ہے۔

ابو اسحاق اسفرائینی نے اس مسلک سے بھی اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک فعل بجائے خود اور فعل کی صفات (حسن و قبح) دونوں معاً بندے اور خدا دونوں کی قدرت کے تحت ظہور میں آتے ہیں۔

امام الحرمین نے ان دونوں کے مذہب کو رد کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بندے میں قدرت اور ارادہ پیدا کیا ہے' پھر اسی قدرت اور ارادہ سے بندے کے مقدورات اور مرادات حاصل ہوتے ہیں۔

امام غزالی (جو مذہب جبر کے پرزور وکیل ہیں) کا کہنا ہے کہ بندہ کی قدرت کی کوئی تاثیر نہیں۔ وہ کسب کو ایک اسم بامسمیٰ سمجھتے ہیں۔ اللہ کو بندوں کے تمام افعال کا خالق قرار دے کر کہتے ہیں کہ کفر و ایمان' طاعت و معصیت' ہدایت و ضلالت سب کچھ اللہ ہی اپنے بندوں میں پیدا کرتا ہے۔ بقول ان کے یہ ممکن نہیں کہ اللہ کسی سے کفر کے صدور کا ارادہ کرے اور وہ مؤمن ہو جائے' یا اللہ کے علم میں کوئی شخص مؤمن ہو اور وہ کافر ہو جائے۔ رہا یہ سوال کہ جب سب چیزوں کا فیصلہ پہلے سے ہو چکا ہے اور بندوں میں اس کے خلاف چلنے کی طاقت نہیں تو پھر اوامر و نواہی کی تکلیف کیونکر جائز ہوگی؟ اس کا جواب امام صاحب یہ دیتے ہیں کہ اللہ کے لیے تکلیف مالا یطاق جائز ہے اور اس کے کاموں میں کیوں' کیسے اور کس لیے؟ کا سوال نہیں ہوسکتا۔ ☆

بہرحال اشاعرہ اور ان کے ہم خیال حضرات خواہ کسب کے قائل ہوں یا نہ ہوں اور قدرتِ حادثہ کے لیے کسی قسم کی تاثیر مانتے ہوں یا نہ' ان کے اعتقاد کا منطقی نتیجہ خالص جبر ہی ہے۔ کیونکہ جب خدا اپنے

☆ نوٹ: اس مسئلہ (جبر و قدر) کو سمجھنے کے لیے مولانا مودودی کا تحریر کردہ کتابچہ ''مسئلہ جبر و قدر'' کا مطالعہ نہایت مفید ہے۔ اس مسئلہ میں مضمون نگار نے اس سے کافی مدد لی ہے۔

بندوں کا خالق ہے اور اسی نے ان سے اچھے اور برے اعمال کے صدور کا ارادہ کیا ہے تو دو صورتوں سے ایک صورت ضرور ہوگی۔ یا تو بندہ میں قضائے الٰہی کے خلاف عمل کرنے کی قدرت ہوگی یا نہ ہوگی۔ صورتِ اوّل میں بندے کی قدرت اور اس کے ارادہ کا خدا کی قدرت اور اس کے ارادے پر غالب آنا لازم آتا ہے اور یہ بالاتفاق باطل ہے۔ بصورتِ دوم خدا کی قدرت کے آگے بندے کی قدرت کا بے اثر اور خدا کے ارادہ کے سامنے بندے کے ارادہ کا بے چارہ ہونا لازم آتا ہے، جس کے بعد کسب اور قدرتِ حادثہ کا عدم اور وجود برابر ہے، اور یہی خالص جبریت ہے۔ شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ اس کو جبر کامل کہتے ہیں۔

ماتریدیہ کا مسلک

ماتریدیہ کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کا خالق ہے، اس کائناتِ ارضی کی ہر چیز اُس کی پیدا کردہ ہے، خلق اشیاء میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں ہے۔ خلق اشیاء کے فعل کو کسی اور کے لیے ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ خدا کا شریک ہے۔ ماتریدی کے بقول حکمتِ خداوندی اس امر کی مقتضی ہے کہ بندہ صرف انہی افعال میں جزا کا استحقاق رکھتا ہے جن میں وہ بااختیار ہو۔ سزا کو بھی اسی پر قیاس کیجیے، بلکہ سزا دینا جہاں حکمت کا مقتضا ہے وہاں قرین عدل و انصاف بھی ہے۔

ماتریدیہ کے نظریہ کا حاصل یہ ہے کہ افعال العباد خدا کے پیدا کردہ ہیں اور اس کی دی ہوئی قوت سے انجام پاتے ہیں۔ رہا یہ سوال کہ ایک طرف بندے کو فاعل مختار قرار دیا جائے اور دوسری جانب یہ کہا جائے کہ افعال اللہ کے پیدا کردہ ہیں اور اُس کی قدرت سے انجام پاتے ہیں، یہ کیونکر ممکن ہے؟ اشاعرہ کی طرح ماتریدیہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ بندہ کاسب افعال ہے، اور کسبِ افعال میں وہ بااختیار ہے، اور اسی بنا پر وہ ثواب وعقاب کا مستحق ٹھہرتا ہے۔ اس رائے کے اظہار میں اشاعرہ و ماتریدیہ یک زبان ہیں، مگر آگے چل کر ان میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔ اشعری کہتے ہیں کہ خدا کے پیدا کردہ افعال اور بندے کے اختیار میں وجہ افتراق و اتصال بندے کا کسب ہے، اگرچہ بندہ بذاتِ خود کسب میں مؤثر نہیں، بنا بریں افعال کی طرح کسب بھی خدا کا پیدا کردہ ہوگا۔ لیکن اگر بندہ فعل میں مؤثر نہیں تو اس کا بااختیار ہونا بے معنی ہے اسی لیے علماء نے اس نظریے کو جبر متوسط کا نام دیا ہے۔

ماتریدی کے نزدیک کسب خدا کی ودیعت کردہ قدرت کی بنا پر معرض وجود میں آتا ہے۔ بقول ماتریدی بندہ قدرتِ مخلوقہ کے بل بوتے پر کسبِ افعال اور عدم کسب دونوں پر قادر ہے، گویا وہ آزاد علی الاطلاق(٦٣) ہے، چاہے کسی فعل کو انجام دے یا چھوڑ دے۔ ثواب وعقاب کا مبنیٰ یہی ہے۔ اندریں صورت خدا کے خالق افعال ہونے اور بندہ کے اختیار میں منافاۃ نہیں ہوگی۔

اس سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ ماتریدی کا نظریہ معتزلہ اور اشاعرہ کے نقطہ ہائے نگاہ کی نسبت متوسط ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ افعال خدا کی ودیعت کردہ قدرت کی بنا پر صادر ہوتے ہیں۔ اشاعرہ کی

رائے ہے کہ بندے میں فعل کی قدرت نہیں' بلکہ اس میں کسبِ فعل پایا جاتا ہے' جس میں بندہ بذاتِ خود مؤثر نہیں۔ ماتریدیہ کی رائے ہے کہ کسبِ فعل بندے کی قدرت وتأثیر سے ہوتا ہے۔ بندے کی یہ قدرت جو تأثیر فی الکسب کی موجب ہوتی ہے اس کو استطاعت بھی کہا جاتا ہے' جو امامِ ابوحنیفہؒ کے نزدیک تکلیفِ احکام کا مدار و مبنیٰ ہے۔ یہ قدرت بندے میں وجودِ فعل کے وقت پیدا ہوتی ہے (۶۴) اس لیے کہ یہ قدرتِ متجددہ حادثہ ہے جو وقوعِ فعل سے قبل وجود میں نہیں آ سکتی۔ معتزلہ کے نزدیک استطاعت وقوعِ فعل سے قبل ہوتی ہے اور اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ بندے کو مخاطب کر کے مکلّف بالاعمال ظہورِ فعل سے قبل کیا جاتا ہے نہ کہ اس کے بعد۔ لہٰذا استطاعت کا ظہورِ فعل سے قبل پایا جانا ضروری ہے۔ (جاری ہے)

حواشی

(٤٣) الاعلام' ٢٤٢/٧۔ومفتاح السعادۃ' ٢١/٢۔

(٤٤) علم الکلام' ٧٥/١ و الروضۃ البھیۃ فیما بین الاشاعرۃ والماتریدیۃ' ص ٤۔

(٤٥) علم الکلام' ٧٥/١۔ والروضۃ البھیۃ' ص٤ والفوائد البھیہ'ص ١٩٥۔ ومفتاح السعادۃ' ٢١/٢۔ والجواھر المضیئۃ' ١٣/٢۔ الزرکلی الاعلام ' ٢٤٢/٧' عمر رضا کحالہ' معجم المؤلفین ٣٥/١١۔

(٤٦) ایضاً۔

(٤٧) اسلامی مذاھب' اردو ترجمہ الفرق الاسلامیہ' ص ٢٩٨ و ٢٩٩۔

(٤٨) ابوعذبہ الحسین بن عبدالمحسن' الروضۃ البھیۃ فیما وقع بین الاشاعرۃ والماتریدیۃ' ص ٣۔

(٤٩) الکامل فی التاریخ' واقعات ٤٦٦۔

(٥٠) الروضۃ البھیۃ' ص ٥۔

(٥١) علم الکلام' ص ٧٦۔

(٥٢) مقالات الاسلامیین' ٤٣/٢۔

(٥٣) الملل والنحل' ص ٥٧۔

(٥٤) کتاب الرد علی المنطقیین' احمد بن تیمیہ' ص ٤٢٠و ٤٢١۔مطبوعہ ادارہ ترجمان السنۃ' ایبک روڈ لاھور۔

(٥٥) ایضاً' ص ٤٢٢۔

(٥٦) مفتاح دار السعادۃ' ٢٦/٢ تا ١٣٣۔

(٥٧) ارشاد الفحول الی تحقیق الحق من علم الاصول' محمد بن علی بن محمد الشوکانی' دار الفکر' بیروت' البحث الثانی فی الحاکم' ص ٩۔ (نوٹ) **اس مسئلہ کی تفصیلات اور معتزلہ واشاعرہ کے مسلک کے مقابلے میں ماتریدیہ کے مسلک کے راجح ہونے کے دلائل کے بارے میں عصر حاضر کے ایک جید فقیہہ ڈاکٹر** وھبۃ الزحیلی **کی کتاب** "اصول الفقہ الاسلامی" **کے جلد اوّل صفحہ ۱۱۵ سے صفحہ ۱۳۱ تک کا مطالعہ**

نہایت ہی مفید رہے گا۔

(٥٨) كتاب الرد على المنطقيين، ص ٤٢٣۔

(٥٩) مجموعة الرسائل والمسائل: ١٢١/٥۔

(٦٠) منهاج السنة النبوية : ٣٦٦/١۔

(٦١) مذهب القدرية وجود الافعال الاختيارية بالقدرة الحادثة فقط مباشرة وتولداً۔ الجوهر المنيفة فى شرح وصية الامام الاعظم ابى حنيفة، ملا حسين بن اسكندر، ص ٦٩۔

(٦٢) مذهب الجبرية : وجود الافعال كلها بالقدرة الازلية فقط من غير مقارنة لقدرة حادثة۔ الجوهرة المنيفة فى شرح وصية الامام الاعظم ابى حنيفة، ملا حسين بن اسكندرالحنبلى، ص ٦٩۔

(٦٣) والحاصل ان افعال العباد واقعة بقدرة اللّٰه تعالىٰ وكسب العبد على معنى ان اللّٰه تعالىٰ اجرى عادته بان العبد اذا صمم العزم على فعل الطاعة يخلق اللّٰه فعل الطاعة فيه واذا عزم على المعصية يخلق اللّٰه فعل المعصية فيه وعلى هذا يكون العبد كالموجد لفعله وان لم يكن موجدا حقيقة۔ الجوهرة المنيفة فى وصية الامام الاعظم ابى حنيفة، ملا حسين بن اسكندر، ص ٦٩۔

(٦٤) قال ابوحنيفة ونقر بان الاستطاعة والقدرة والطاقة مع الفعل لا قبل الفعل ولا بعد الفعل۔ قال الشارح : لانه لو كان قبل الفعل لكان العبد مستغنيا عن الله تعالى وقت الحاجة فهذا خلاف حكم النص لقوله تعالى : ﴿وَاللّٰهُ الْغَنِىُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاءُ﴾ ولو كان بعد الفعل لكان من المحال لانه حصول الفعل بلا استطاعته وقدرته ولا طاعة لمخلوق فى فعل ما لم تقارنه الاستطاعة من اللّٰه تعالىٰ۔ ايضاً، ص ٧٤۔ ۞

بقیہ: انسانی جسم اور ذہن پر موسیقی کے اثرات

کا جنون ہے۔ اس کے علاوہ کوئی چیز ان کو محظوظ نہیں کر سکتی۔ وہ کسی ایسی چیز کو سنجیدگی سے نہیں لیتے جس کا تعلق موسیقی سے نہ ہو۔ وہ موسیقی کے لیے بے چین رہتے ہیں۔ اپنے سکول کے وقت میں یا جب وہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ہوتے ہیں، گھروں میں، کاروں میں ہر جگہ موسیقی کے سٹیریوز موجود ہیں۔ موسیقی کی محفلیں ہیں۔ ہر جگہ موسیقی کے چینلز مل جاتے ہیں۔ واک مین کی وجہ سے سفر کے دوران اور کتب خانوں سمیت کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں طلبہ کو میوزک سے بچا کر اور روک کر رکھا جا سکے۔ جب تک ان کے ساتھ واک مین ہے، ان کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ عظیم روایات کا کیا مطالبہ ہے۔ موسیقی کی اس طویل رفاقت کے بعد جب وہ کانوں سے اس کو ہٹائیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ بہرے ہو چکے ہیں۔

[یہ مضمون ڈاکٹر گوہر مشتاق کی کتاب ''موسیقی: اسلام اور جدید سائنس کی روشنی میں'' (مطبوعہ از اِن سحر پبلی کیشنز، منصورہ، ملتان روڈ، لاہور۔ ۲۰۰۹ء) سے ماخوذ ہے۔ اختصار کے پیشِ نظر مراجع و مصادر کے حوالہ جات حذف کر دیے گئے ہیں۔ تفصیل کے لیے اصل کتاب ملاحظہ فرمائیے۔]

فرقہ اباضیہ اور اس کے معتقدات

حافظ طاہر اسلام عسکری

خوارج کا شمار قدیم ترین فرقوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ فرقہ شاید معدوم ہو چکا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خارجیوں کا ایک اہم گروہ جو اباضیہ کے نام سے معروف ہے' آج تک موجود ہے۔ زیر نظر تحریر میں اس کا تعارف پیش کیا جا رہا ہے تا کہ ان کے عقائد و نظریات سے آگاہی حاصل ہو سکے۔ یہ مضمون ''**الموسوعة الميّسرة في الاديان والمذاهب والاحزاب المعاصرة**'' (جلد اوّل) سے لیا گیا ہے۔ دیگر مراجع سے استفادہ کرتے ہوئے بعض زائد معلومات حاشیہ میں درج کی گئی ہیں۔ (ط ۔ ا)

خوارج کے متعدد فرقوں میں سے ایک فرقہ اباضیہ ہے' جو اپنے بانی **عبداللہ بن اباض التمیمی** کی جانب منسوب ہے۔[1] اس فرقے کے پیروکاروں کا دعویٰ ہے کہ وہ خارجیوں میں شامل نہیں ہیں' اسی لیے وہ اس نسبت کی نفی کرتے ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ غالی خارجیوں میں تو شمار نہیں ہوتے' مثلاً ''ازارقہ'' وغیرہ جو خارجیوں کا ایک غلو پسند گروہ ہے' لیکن یہ لوگ کئی معاملات میں خوارج سے متفق ہیں۔ خود عبداللہ بن اباض اپنے آپ کو خارجیوں کے **المحکّمة الاولیٰ**[2] ہی کا تسلسل قرار دیتا تھا۔ یہ خوارج کی طرح تعطیلِ صفات' قرآن کریم کے مخلوق ہونے اور ظالم حکمرانوں کے خلاف خروج کے قائل ہیں۔

---

(۱) واضح رہے کہ پہلے پہل اباضی اس نسبت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کے مطابق اصلاً ان کا مذہب جابر بن زید سے منسوب ہے۔ یہ اپنے آپ کو **جماعة المسلمین**' **اھل الدّعوة** یا **اھل الاستقامة** کے ناموں سے موسوم کرتے رہے ہیں۔ 'اباضیہ' کا عنوان انہوں نے تیسری صدی ہجری کے بعد تسلیم کیا جب وہ مشہور و معروف ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ شہرت کے سلسلے میں اباضی مفکرین کا کہنا ہے کہ بعض سیاسی اور کلامی مباحث میں عبداللہ بن اباض کی آراء بہت مشہور ہو گئی تھیں' چنانچہ اُموی اور عباسی حکمرانوں نے ان آراء کے حاملین کو عبداللہ بن اباض کی طرف منسوب کر دیا۔ بعد ازاں مذہب کی نسبت بھی اس کے حوالے سے معروف ہو گئی۔ [اجوبة ابن خلفون' ص۹' حاشیہ ۱]

(۲) **المحکّمة الاولیٰ** سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے سب سے پہلے مسئلۂ تحکیم کی بنا پر سیدنا علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے خلاف اعلانِ بغاوت (خروج) کیا تھا۔ [الملل والنحل' اردو' ص ۱۷۶]

☆تأسیس اور نمایاں شخصیات

● عبداللہ بن اباض: اس فرقے کا مؤسس اوّل عبداللہ بن اباض ہے جو بنی مرۃ بن عبید بن تمیم سے تعلق رکھتا ہے۔ قبیلہ تمیم بصرہ میں سکونت پذیر تھا۔ حضرت احنف بن قیسؒ بھی اسی قبیلے میں سے تھے۔ ابن اباض نے سیدنا معاویہ رضی اللہ عنہ کا زمانہ پایا ہے۔ اس کی ولادت ۴۰ھ سے ۶۰ھ کے درمیان اور وفات عہدِ عبدالملک بن مروان کے آخری ایام [۸۶ھ] میں ہوئی۔ (۳)

● جابر بن زید: اباضیوں کے مطابق ان کی ایک نمایاں ترین شخصیت جابر بن زیدؒ (۲۲۔۹۳ھ) ہیں۔ انہیں ان لوگوں میں شمار کیا جاتا ہے جو بالکل ابتدائی زمانہ ہی میں تدوین حدیث کے کام میں مشغول ہو گئے تھے۔ سیدنا ابن عباس، اُمّ المؤمنین سیدہ عائشہ، سیدنا انس بن مالک اور سیدنا ابن عمر رضی اللہ عنہم جیسے کبار صحابہ کرام سے علم حاصل کیا۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ خود جابر نے ان خارجیوں سے اظہارِ براءت کیا ہے۔ (دیکھئے تہذیب التہذیب، ج ۲، ص ۳۸) (۴)

---

(۳) عبداللہ بن اباض کے بارے میں کتب تاریخ و تراجم سے کچھ زیادہ تفصیلی معلومات حاصل نہیں ہوسکیں۔ علامہ شہرستانیؒ کے بقول اس نے اُموی خلیفہ مروان بن محمد کے دورِ حکومت میں بغاوت کی تھی۔ مروان نے اس کے مقابلے کے لیے عبداللہ بن محمد بن عطیہ کو روانہ کیا۔ چنانچہ دونوں میں تبالہ کے مقام پر جنگ ہوئی، جو یمن کے علاقے صنعا کے راستے میں واقع ہے۔ [الملل والنحل اردو، مترجم پروفیسر علی محسن صدیقی، ص ۲۰۰] اباضی مصنف ڈاکٹر عوض خلیفات کے مطابق اباضیہ اس امر پر متفق ہیں کہ عبداللہ بن اباض ان کا مؤسس حقیقی نہیں اگرچہ وہ علم و تقویٰ میں نمایاں اور ممتاز اباضی علماء میں شامل ہے۔ [نشأة الحركة الاباضية، عوض خليفات، ص ۸۳]

(۴) اباضی بڑے شدومد سے اپنے آپ کو ابوالشعثاء جابر بن زیدؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لہٰذا مناسب ہے کہ موصوف کے تعارف اور اباضی دعوے کی حقیقت پر قدرے مفصل کلام کیا جائے۔ امام جابر بن زیدؒ **الازدی الیحمدی الجوفی** کا تعلق عمان سے تھا۔ بعد ازاں آپؒ بصرہ میں اقامت گزین رہے۔ اسی بناء پر آپ کو العمانی البصری بھی کہا جاتا ہے۔ آپؒ سیدنا عبداللہ بن عباسؓ کے نمایاں اور ارشد تلامذہ میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ کو سیدنا ابن عمر اور سیدنا ابن زبیر رضی اللہ عنہم سے روایت حدیث کا شرف بھی حاصل ہے۔ [الجرح والتعديل، ابن ابی حاتم: ۴۹/۱] سیدنا ابن عمرؓ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: **انک من فقهاء اهل البصرة** [الحلية: ۸۳/۳] صحابی جلیل سیدنا جابر بن عبداللہ الانصاریؓ سے زیادہ بن جبیرؒ نے ایک مسئلہ دریافت کیا تو انہوں نے مسئلے کا جواب دے کر فرمایا تم ہم سے کیسے سوال کرتے ہو جبکہ تمہارے مابین جابر ابوالشعثاء جیسا عالم موجود ہے۔ [ایضاً ۸۶/۳] یہ تو صحابہ کرامؓ کے ریمارکس تھے۔ دیگر علمائے سلف نے بھی حضرت جابر بن زیدؒ کی تعدیل و توثیق فرمائی ہے، جن میں امام محمد بن سیرین، ایاس بن معاویہ البصری، عمرو بن دینار، یحییٰ بن معین، العجلی، ابوزرعہ اور ابوحاتم الرازی رحمہم اللہ جیسے اساطین علم شامل ہیں۔ امام ابن حبان فرماتے ہیں: **كان من** ◀◀

● ابوعبیدۃ مسلمہ بن ابی کریمۃ: ابوعبیدۃ' جابر بن زید کے مشہور ترین تلامذہ میں سے ہے۔ جابر کے بعد یہی اباضی فرقے کا مرجع قرار پایا تھا۔ یہ قفاف کے لقب سے مشہور تھا۔ اس نے بعہدِ ابوجعفر منصور (۱۵۸ھ) وفات پائی۔

◀◀ اعلم الناس بکتاب الله ...... وكان فقيها[الثقات: ١٥١/٦] علامہ ذہبی لکھتے ہیں: كان عالم اهل البصرة فى زمانه يعد مع الحسن وابن سيرين [تذكرة الحفاظ: ٧٢/١'سير اعلام النبلاء:٤/ ١٨٤] حافظ ابن حجر عسقلانیؒ رقم طراز ہیں کہ هو ثقة فقيه [تقريب التهذيب ' ج ١٢٢/١] امام جابر بن زیدؒ کے بارے میں اصحابِ رسولؐ اور دیگر اہل علم کے مندرجہ ذیل اقوال سے یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ موصوف کا اباضی خارجیوں سے کوئی تعلق نہ تھا' ورنہ علمائے سلف ان کی مدح وثنا نہ فرماتے۔ اس پر مستزاد یہ کہ خود ابوالشعثاء نے اباضیہ سے اپنے تعلق کی صراحتاً نفی فرمائی ہے۔ عزرہ بن ثابت الانصاریؒ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن زیدؒ سے سوال کیا کہ اباضیوں کے بقول آپ انہی کے ہم خیال ہیں؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں بارگاہِ ایزدی میں ان سے اظہارِ براءت کرتا ہوں۔ [طبقات ابن سعد: ١٨١/٧] ثابت سے مروی ہے کہ امام حسنؒ نے جابرؒ سے کہا: اباضیہ آپ سے نسبت کے مدعی ہیں تو انہوں نے یہی جواب دیا۔ نیز اہل نہروان سے بھی بے زاری اور لاتعلقی کا اعلان کیا۔ [ایضاً: ١٨٢/٧] امام ابن سیرینؒ نے بھی موصوف کو اباضی افکار سے بری قرار دیا ہے۔ (ایضاً) اباضی مصنف یحییٰ بن محمد بکوش نے اپنی کتاب ''فقه الامام جابر بن زيد (ص ۲۶ تا ۲۹) میں امام جابرؒ کو اباضی ثابت کرنے کی سعی کی ہے اور اس کے لیے بطور خاص دو دلیلوں پر زور دیا ہے۔ پہلی یہ کہ علامہ شہرستانیؒ نے اپنی کتاب الملل والنحل میں امام موصوف کو خارجی اباضی علماء میں شمار کیا ہے۔ دوسری یہ کہ علامہ ابن حجرؒ نے یحییٰ بن معینؒ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ جابرؒ اباضی تھے۔ اس سلسلے میں چند نکات قابل توجہ ہیں:

اوّلاً: تہذیب التہذیب میں حافظ ابن حجرؒ نے ابن معینؒ کے اس قول کو علامہ الساجیؒ کی طرف منسوب کیا جائے لیکن بے سند ہونے کی بنا پر یہ محتاج ثبوت ہے تاکہ اس کی صحت وضعف کا تعین کیا جا سکے' کیونکہ اس کے معارض اقوال بھی موجود ہیں' جیسا کہ اوپر بیان ہوئے۔

ثانیاً: بالفرض اس کی نسبت یحییٰ بن معین سے درست ثابت ہو جائے تو بھی یہ لائق التفات نہیں' کیونکہ: (۱) یحییٰ بن معین اور جابر بن زیدؒ کے مابین طویل زمانی فاصلہ حائل ہے۔ اس لیے کہ جابرؒ کی وفات ۹۳ھ میں ہوئی جبکہ یحییٰ بن معین کا انتقال ۲۳۳ھ میں بعمر ۷۷ برس ہوا۔ (۲) امام جابر بن زیدؒ نے خود اس اتہام کی نفی فرمائی ہے جو بسند صحیح ثابت ہے' جیسا کہ مذکور ہوا۔ (۳) امام جابر کے معاصر ابن سیرینؒ نے بھی اس نسبت کا انکار کیا ہے جو کہ یحییٰ بن معینؒ کے قول پر فوقیت رکھتا ہے۔ (۴) علامہ ابن حجرؒ کے طرزِ عمل سے بھی یحییٰ بن معینؒ کے قولِ مذکور کی کمزوری ظاہر ہوتی ہے' کیونکہ انہوں نے اس سے پہلے اس کے برعکس اقوال نقل کیے ہیں۔

ثالثاً: جہاں تک شہرستانی کا تعلق ہے تو انہوں نے اگرچہ عمومی طور پر جابر کا تذکرہ خوارج کے ذیل میں کیا ◀◀

● الربیع بن حبیب الفراہیدی: یہ دوسری صدی ہجری کے وسط کا اباضی امام ہے۔ فرقہ اباضیہ کے پیروکار اس کی طرف ایک مسند منسوب کرتے ہیں جو کہ مسند الربیع بن حبیب کے نام سے معروف ہے۔ یہ شائع ہو چکی ہے اور عام وخاص میں متداول ہے۔ (۵)

◀◀ ہے لیکن نہ تو انہیں خارجی علماء میں شمار کیا ہے اور نہ ہی ان کے اباضی ہونے کی تصریح فرمائی ہے' جیسا کہ عبداللہ بن یزید' محمد بن حرب اور یحییٰ بن کامل کو صراحت سے اباضی قرار دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس قول کی صحت پر زیادہ اصرار نہیں۔

رابعاً: یہ نکتہ بھی قابل لحاظ ہے کہ التهذیب اور الملل و النحل میں مختلف اقوال وآراء کو جمع کیا گیا ہے' ان کی قطعیت ثابت نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ ان میں موجود کئی اقوال پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچتے لہٰذا یہ کہنا درست نہیں کہ ان میں لازماً درست معلومات ہی درج ہوں گی۔ اباضیہ سے تعلق کی نفی سے متعلق جابر بن زیدؒ اور دیگر علمائے سلف کے اقوال کی توجیہہ کرتے ہوئے یحییٰ بکوش نے لکھا ہے کہ جابر نے ایسا ازراہِ تقیہ کہا ہوگا یا یہ سنی راویوں کی وضع کردہ روایات ہیں۔ لیکن جابر بن زیدؒ جیسے زاہد وعابد اور عالم وفقیہہ سے تقیہ کے نام پر جھوٹ اور کذب بیانی کا صدور بعید از عقل نظر آتا ہے۔ رہا روایات گھڑنے کا الزام تو یہ بلا دلیل ہے جس کی دنیائے علم میں کوئی وقعت نہیں۔ جابر سے اباضیوں کی نسبت کی ایک توجیہہ یہ ہو سکتی ہے کہ جابر کا تعلق عمان سے ہے جو کہ اباضیوں کا قدیم ترین اور اولین مرکز ہے۔ گویا یہ نسبت علاقائی ہے نہ کہ اعتقادی۔

(۵) اباضیوں کے مطابق الربیع بن حبیب ایک عظیم محدث اور اباضی فرقے کا ایک نمایاں ترین لیڈر تھا۔ یہ ابوعبیدہ مسلمہ بن ابی کریمہ کا شاگرد تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے امام جابر بن زیدؒ سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اباضی مفکرین اس کی المسند (جسے **الجامع الصحیح** کا نام بھی دیا گیا ہے) کو قرآن شریف کے بعد صحیح ترین کتاب حدیث کا درجہ دیتے ہیں۔ فرقہ اباضیہ کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ولادت ۷۵ھ سے ۸۰ھ کے درمیان اور وفات ۱۷۱ھ سے ۱۸۰ھ کے مابین ہوئی۔ یہ عمان میں مدفون ہے۔ اباضیوں کی نگاہ میں اس کے مقام ومرتبے کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب اس کا استاد ابوعبیدہ حالت مرض میں تھا تو اسے حج میں اپنا قائم مقام مقرر کیا۔ اسی طرح جب اباضی حاکم عبدالوہاب بن عبدالرحمٰن بن اسلم کا ایک گروہ سے تنازعہ ہوا تھا تو فریقین نے موصوف کو متفقہ طور پر ثالث تسلیم کیا۔ [الربیع بن حبیب محدثاً وفقیہا از عمرو بن معود الکاباوی و دیگر مصادرِ اباضیہ]

یہ تو اباضی حضرات کے دعاوی ہیں' لیکن علمائے محققین کی نظر میں یہ دعوے چنداں لائق التفات نہیں' جس کی وجوہ درج ذیل ہیں:

اولاً: مسند مذکور کا کوئی ایسا مخطوطہ دستیاب نہیں جس پر اعتماد کیا جا سکے۔

ثانیاً: صاحب کتاب الربیع بن حبیب کا امر واقعہ میں کبھی کوئی وجود نہیں رہا بلکہ یہ محض ایک وہمی اور خیالی شخصیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم کتب تاریخ ورجال میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔ یہ انتہائی حیرت انگیز امر ہے کہ ایک ایسا شخص جو فن حدیث کا امام ہو اور ایک فرقے کا مرکزی قائد ہو لیکن مؤرخین اس کے ◀◀

● **شمالی افریقہ کے اباضی حکمران**: سلطنت عباسیہ کے زمانے میں درج ذیل اباضی فرمانرواؤں کے نام ملتے ہیں:

◀◀ وجود سے قطعی بے خبر ہوں اور اس کے بارے میں کسی کتاب میں چند سطریں بھی تحریر نہ کی گئی ہوں جس سے اس کا تعارف ممکن ہو سکے۔ فن حدیث کے جلیل القدر عالم علامہ البانیؒ نے بھی الربیع اور اس کی مسند کو مجہول قرار دیا ہے۔ [صفة صلوٰة النبی ﷺ ص ۸۸ نیز السلسلة الضعيفة: ۱۰۵/۱۳] یہاں یہ امر بھی پیش نظر رہے کہ کتب رجال میں الربیع بن حبیب کے نام سے بعض رجال کا ذکر ملتا ہے لیکن اباضیوں کا الربیع ان سے بہر حال الگ ہے، جیسا کہ ان کے کوائف کی تفاصیل سے واضح ہے۔

ثالثاً: کتاب مذکور کی زیادہ تر احادیث میں الربیع کا شیخ ابوعبیدہ ہے جسے امام جابر کا شاگرد قرار دیا جاتا ہے لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ کتب رجال میں اس کا ترجمہ بھی موجود نہیں، گویا یہ بھی ایک ''فرضی'' امام ہے۔

رابعاً: مسند الربیع آج جس ترتیب کے ساتھ مطبوع و متداول ہے وہ ابویعقوب یوسف بن ابراہیم الوارجلانی کی قائم کردہ ہے۔ بقول اباضیہ مرتب موصوف چھٹی صدی ہجری کا ''محدث شہیر'' ہے لیکن یہ امر باعث تعجب ہے کہ اس زمانے میں لکھی جانے والی کتب تاریخ میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا۔ مثلاً **التكملة لوفيات النقلة**، **سير اعلام النبلاء** یا تاریخ الاسلام وغیرہ کتب جو اسی دور کے رجال واحوال کا احاطہ کرتی ہیں، اس اباضی محدث کے ذکر سے خالی ہیں!! گویا کتاب مذکور سے متعلق تمام شخصیات مجہولیت و گمنامی کے دبیز پردوں میں محجوب و مستور ہیں، جن تک رسائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ (واضح رہے کہ اباضی مصنفین کے مطابق الربیع نے کتاب کو ''المسند'' کے طور پر تالیف کیا تھا، بعد ازاں الوارجلانی نے چھٹی صدی ہجری میں اسے فقہی ابواب کے طرز پر مرتب کیا اور اس میں بعض اضافے کر کے چار اجزاء میں تقسیم کیا جو یکجا صورت میں شائع کیے جاتے ہیں۔ پہلے دو اجزاء میں موجود احادیث کو اباضی وہی درجہ دیتے ہیں جو اہل سنت کے نزدیک بخاری و مسلم کی روایات کا ہے۔ کتابِ مذکور کی متعدد شروح تحریر کی گئی ہیں۔ ان میں الشیخ عبداللہ محمد بن عمر بن **ابی ستة القضبی** (متوفی ۱۰۸۷ھ) اور الشیخ نورالدین ابومحمد عبداللہ بن حمید السالمی (متوفی ۱۳۳۲ھ) کی شروح قابل ذکر ہیں۔ مؤخر الذکر کا شمار عمان کے مشہور اباضی علماء میں ہوتا تھا اور اسی کی شرح نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ استاذ محمد ادریس نے کتاب مذکور کی احادیث تخریج و تحقیق کی ہے اور ان کا دیگر کتب احادیث سے موازنہ کیا ہے۔)

خامساً: اگر کتاب مذکور دوسری صدی ہجری یعنی ۱۷۰ھ کے لگ بھگ موجود ہوتی اور اس کی احادیث معروف ہوتیں تو انہیں انتہائی شہرت حاصل ہوتی، کیونکہ اس کی اسناد عالی ہیں اور علمائے سلف عالی اسناد کے انتہائی شائق تھے۔ ان کے نزدیک راوی کا خارجی ہونا روایت حدیث میں مانع نہیں جیسا کہ عمران بن حطّان کا معاملہ ہے۔ یہ شخص سیدنا علیؓ کے قاتل عبدالرحمٰن بن ملجم کی مدح کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود علمائے سنت نے اس سے روایت لی ہے۔ چنانچہ الربیع (خواہ خارجی ہی ہو) اگر احادیث بیان کرتا تو یہ خود اور اس کی کتاب معروف ہوتی۔ حتیٰ کہ اگر یہ ضعیف بھی ہوتا تو علماء کم از کم اس کا ضعف ہی بیان کرتے ◀◀

حارث بن تلید، ابوالخطاب عبدالاعلیٰ بن المسح المعافری، ابوحاتم یعقوب بن حبیب، حاتم الملز وزی۔

◄◄ اس کی وجہ یہ ہے کہ فرقہ زیدیہ کے ہاں بھی مسند زید بن علی کے نام سے حدیث کی ایک کتاب مشہور ہے۔ اس کا راوی عمرو بن خالد ہے جو احادیث وضع کیا کرتا تھا۔ چنانچہ وکیع بن الجراحؒ اور امام احمد بن حنبلؒ جیسے ماہرینِ فن نے اس کے کذاب اور واضع ہونے کی تصریح کی ہے۔لیکن اس کے برعکس الربیع اور اس کی مسند کا ادنیٰ سا تذکرہ بھی نہیں ملتا، نہ جرح کے اعتبار سے اور نہ تعدیل کے پہلو سے۔

نکتہ زیر بحث کی اہمیت اس اعتبار سے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مسند الربیع میں بعض ایسی احادیث موجود ہیں جو اہل سنت کے نزدیک غریب ہیں اور صرف ایک صحابی ہی سے مروی ہیں۔ مثلاً شہرۂ آفاق حدیث ((اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ))۔ یہ روایت صرف سیدنا عمرؓ سے منقول ہے (بعض نے اگرچہ سیدنا ابوسعید خدریؓ سے بھی بیان کی ہے جو کہ خطا ہے) لیکن یہی حدیث مسند مذکور میں سیدنا عبداللہ بن عباسؓ سے بھی مروی ہے۔ اگر واقعتاً ابن عباسؓ نے اسے بیان کیا ہوتا تو علمائے سنت لازماً اسے نقل کرتے یا کم از کم اس پر نقد ہی کرتے جیسا کہ سیدنا ابوسعیدؓ والی روایت پر کیا ہے۔

سادساً: مسند مذکور میں بہت سی موضوع اور بے سروپا روایات ہیں جنہیں کسی طور حدیث رسولؐ باور نہیں کیا جا سکتا۔ علامہ البانیؒ کے بقول یہ کتاب منکر اور باطل روایات سے بھری پڑی ہے (السلسلة الضعيفة: ۱۰۵/۱۳) مثلاً ''علم حاصل کرو خواہ چین جانا پڑے''۔اس روایت کو علمائے حدیث نے موضوع قرار دیا ہے لیکن مسند مذکور میں اسے معتبر ترین سند کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔اگر یہ سند واقعتاً موجود ہوتی تو علماء بیک زبان اس حدیث کے جھوٹا اور موضوع ہونے کا حکم کیوں لگاتے؟ اسی طرح مسند مذکور میں ایک روایت یہ بیان کی گئی ہے کہ ''میرے بعد تم اختلاف کرو گے لہٰذا تمہارے پاس میری جانب سے جو کچھ پہنچے اسے قرآن حکیم پر پیش کرو، اگر وہ اس کے موافق ہو تو میری جانب سے ہے اور اگر مخالف ہو تو وہ میری طرف سے نہیں''۔ علامہ ابن عبدالبرؒ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث رسول اکرمﷺ سے ثابت نہیں اور عبدالرحمٰن بن مہدیؒ نے اسے خوارج کی گھڑی ہوئی روایت قرار دیا ہے۔ (التمہید ۲/ ۲۳۳)

سابعاً: کتابِ مذکور میں ایسی بہت سی روایات موجود ہیں جو خوارج کے مخصوص عقائد کی تائید کرتی ہیں، مثلاً رؤیت باری تعالیٰ کا انکار، مرتکب کبائر کی تکفیر، مسح اور قنوت کا انکار وغیرہ۔ یہ روایات کتاب و سنت کی بے شمار صحیح نصوص سے متعارض ہیں۔

☆ایک شبہ کا ازالہ:

مذکورہ بالا تنقیدی نکات کے جواب میں اباضی حضرات مسند مذکور، اس کے مؤلف اور دیگر رواۃ کی عدم شہرت کی ایک توجیہ یہ پیش کرتے ہیں کہ چونکہ اس زمانے میں اموی اور عباسی حکومتوں نے جبر و تشدد کی پالیسی اپنا رکھی تھی، اس لیے یہ منظر عام پر نہ آسکے اور چھپ کر اپنے افکار و نظریات پر کاربند رہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر اس فرقے کے مزعومہ امام جابر بن زیدؒ کا تذکرہ تمام معتبر مصادر میں موجود ہے تو ان کے قریبی شاگردوں اور جانشینوں کا ذکر صفحاتِ تاریخ سے غائب کیوں ہے؟ خصوصاً جبکہ وہ اس جتھے کے قائد اور ◄◄

● احکامِ سلطنت رستمیہ :مغرب میں تاہرت کی رستمی سلطنت پر جواباضی حکمران یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے' ان کے نام یہ ہیں:

عبدالرحمٰن' عبدالوہاب' افلح' ابوبکر' ابوالیقظان' ابوحاتم۔

☆ معروف اباضی علماء

اباضی فرقے کے معروف علماء میں درج ذیل قابل ذکر ہیں:

● سلمہ بن سعد :اس نے دوسری صدی کے اوائل میں اپنے مذہب کی نشر واشاعت میں خاصی سرگرمی سے کام کیا۔

● ابن مقطیر الجناونی :اس نے علوم وفنون کا اکتساب بصرہ سے کیا۔ پھر مذہب اباضی کی ترویج واشاعت کے لیے اپنے وطن جبل نفوسہ (لیبیا) میں واپس آ گیا۔

● عبدالجبار بن قیس المرادی : یہ حارث بن تلید کے عہد حکومت میں قاضی کے عہدے پر فائز تھا۔

● السمع ابوطالب :اس کا شمار دوسری صدی ہجری کے نصف ثانی کے اباضی علماء میں ہوتا ہے۔ یہ امام عبدالوہاب بن رستم کا وزیر تھا۔ بعدازاں ابن رستم نے اسے لیبیا میں جبل نفوسہ اوراس کے گردونواح کا عامل مقرر کیا۔

● ابوذر اَبان بن وسیم : یہ تیسری صدی ہجری کے نصف اوّل کا اباضی عالم تھا۔ یہ اباضی حاکم افلح بن عبدالوہاب کی جانب سے طرابلس کا عامل تھا۔

☆ افکاروعقائد

اباضی فرقے کے لٹریچر کے مطالعہ سے ان کے جو معتقدات سامنے آتے ہیں' ان کا تذکرہ حسب ذیل ہے:

● ان کی کتابوں سے پتا چلتا ہے کہ یہ صفاتِ باری تعالیٰ کے باب میں تعطیل کے قائل ہیں۔ تأویل صفات میں ان کا مسلک معتزلہ کے قریب تر ہے' لیکن ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اس سلسلے میں صحیح عقیدے پر ہیں' بایں معنی کہ یہ صفاتِ الٰہیہ کی ایسی مجازی تأویل کرتے ہیں جس سے مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے اور

◄◄ لیڈر بھی تھے!!

☆ حاصل بحث یہ ہے کہ کتاب مذکور اور اس کے مؤلف کا وجود مشکوک ہے۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ مسند محض اپنے مذہب کی تائید وتصدیق کے لیے ایک قدیم شخصیت کی طرف منسوب کر دی گئی ہے' لہٰذا مذکورۃ الصدر دلائل کی روشنی میں اسے قابل اعتبار نہیں گردانا جا سکتا۔ واللہ اعلم!

تشبیہ بھی لازم نہیں آتی۔

سچ یہ ہے کہ اس مسئلہ میں حق' اہل السنۃ والجماعۃ ہی کے ساتھ ہے' جو دلیل و برہان کی پیروی کرتے ہیں۔ اہل سنت خدا تعالیٰ کے اسماء وصفات کا اسی طرح اثبات کرتے ہیں جیسے خود ربّ کریم نے اپنی ذات کے لیے کیا ہے۔ ان کے عقیدے میں تعطیل کا دخل ہے نہ تکییف کا۔ یہ تحریف سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی تمثیل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ (٦)

- اباضی' آخرت میں رؤیت باری تعالیٰ کے منکر ہیں۔
- یہ بعض اُخروی امور میں مجازی تاویل سے کام لیتے ہیں' مثلاً میزان اور پل صراط وغیرہ۔
- انسانی افعال ان کے نزدیک' تخلیق خدا اور انسان کا اکتساب ہیں۔ گویا ان کا نقطۂ نظر قدریہ اور جبریہ کے بین بین ہے۔
- اباضی عقیدے کے مطابق اللہ تعالیٰ کی صفات' اس کی ذات سے کوئی زائد شے نہیں' بلکہ یہ عین ذات ہیں۔
- قرآن کریم کے بارے میں ان کا زاویۂ نگاہ دیگر خوارج سے متفق ہے کہ یہ مخلوق ہے۔ علامہ اشعریؒ فرماتے ہیں:

والخوارج جميعا يقولون بخلق القرآن (مقالات الاسلاميين' ج ١' ص ٢٠٣)

''تمام خارجی' قرآن شریف کے مخلوق ہونے کے قائل ہیں''۔

- اباضی مسلک کے مطابق' کبیرہ گناہوں کا مرتکب کافر ہے اور اس کا کفر' کفر نعمت یا کفر نفاق کہلاتا ہے۔ (٧)

---

(٦) **تعطیل** کے معنی ہیں صفاتِ الٰہیہ کی نفی کرنا' باری تعالیٰ کو صفات سے عاری قرار دینا' یعنی خدا کو ذاتِ مجرد سمجھنا جیسا کہ فلاسفہ کا نقطۂ نگاہ ہے۔ **تکییف** سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی کیفیت بیان کی جائے' مثلاً یہ کہ وہ عرش پر کس طرح مستوی ہے یا وہ آسمانِ دنیا پر کس طرح نزول فرماتا ہے۔ **تحریف** تغیر و تبدل کو کہتے ہیں' یعنی نصوصِ شریعت کے الفاظ یا معانی کو بدل دینا۔ مثلاً ﴿وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ۝﴾ (النساء) میں لفظ اللہ پر پیش کے بجائے زبر پڑھنا۔ یہ تحریف لفظی ہے۔ یا الفاظ کے حقیقی معانی چھوڑ کر خود ساختہ مفہوم لینا' جیسے غضب کا مطلب ارادۂ انتقام بیان کرنا۔ اسے تحریف معنوی کہا جاتا ہے۔ **تمثیل** یہ ہے کہ خدا کی ذات یا صفات کو مخلوق کے مماثل سمجھا جائے۔ یعنی یہ عقیدہ رکھنا کہ خدا کا سننا' دیکھنا' بولنا وغیرہ انسانوں جیسا ہے۔

(٧) 'کفر نعمت' سے مراد ان کے ہاں 'کفر دون کفر' ہے اور اس کے مقابلہ میں 'کفر اکبر' کے لیے یہ 'کفر ملت' کا لفظ بولتے ہیں۔ ایسے ہی 'کفر نفاق' سے بھی 'کفر اصغر' مراد ہے جبکہ کفر اکبر کے لیے ان کے نزدیک 'کفر شرک' کی اصطلاح رائج ہے۔

● اباضیوں کی نظر میں لوگوں کی تین اقسام ہیں:

۱) مؤمن، جو کامل الایمان ہیں۔

۲) مشرک، جو اپنے شرک میں بالکل واضح ہیں۔

۳) تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہوں نے کلمۂ توحید کا اعلان اور اسلام کا اقرار کیا، لیکن اپنے کردار وطرزِ عمل اور عبادت میں اس پر پابندی سے کاربند نہیں رہے۔ چنانچہ یہ لوگ مشرک نہیں، کہ توحید کے اقراری ہیں۔ لیکن یہ مؤمن بھی نہیں کہ ایمان کے مقتضیات کے پابند نہیں۔ پس توحید کے اقرار کی بناء پر احکامِ دنیا میں یہ مسلمانوں کے ساتھ ہیں اور احکامِ آخرت میں یہ مشرکوں کے ساتھ ہوں گے کیونکہ انہوں نے ایمان کا حق ادا نہیں کیا اور ان امور کی مخالفت کی ہے جنہیں اپنانے یا ترک کرنے کا کلمۂ توحید متقاضی تھا۔

● متاخرین اباضیہ کے نزدیک دار اور اس کے حکم کی متعدد صورتیں ہیں، لیکن وہ اس امر میں اپنے متقدمین سے متفق ہیں کہ ان کے مخالفین دیگر مسلمانوں کی سرزمین دارِ توحید ہے، مگر معسکرات (فوجی چھاؤنیاں/لشکر گاہیں) اس سے مستثنیٰ ہیں کہ وہ ان کی نظر میں 'دارِ بغی' ہیں۔

● اہل قبلہ میں سے اپنے مخالفین کے بارے میں ان کا اعتقاد ہے کہ وہ کافر تو ہیں لیکن مشرک نہیں۔ ان سے شادی بیاہ جائز اور باہمی وراثت حلال ہے۔ اسی طرح یہ لوگ جنگ کے بعد اپنے مخالفین کے اسلحہ، گھوڑوں اور ان تمام چیزوں کو جن سے جنگ وحرب میں کام لیا جاتا ہے، اموالِ غنیمت میں شمار کرتے ہیں یعنی ان کا لینا جائز ہے لیکن ان کے علاوہ دیگر اشیاء کو لوٹنا حرام ہے۔

● اباضی، مرتکب کبیرہ کو کافر کہتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ اپنی معصیت پر مصر رہنے کی صورت میں جنت کا حق دار نہیں اِلا کہ وہ اس سے توبہ کرے، کیونکہ خدا تعالیٰ کبیرہ گناہ کرنے والے کو معاف نہیں فرماتا، سوائے اس صورت میں کہ وہ موت سے قبل توبہ کرلے۔

● کبیرہ گناہ کے مرتکب پر اباضی لفظ کافر کا اطلاق تو کرتے ہیں لیکن اسے کفرنعمت یا کفرنفاق سے متصف قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ ایسا کفر نہیں جو ملت اسلامیہ سے خارج کردے۔ اس کے برعکس اہل سنت والجماعت اسے عصیان یا فسق سے تعبیر کرتے ہیں۔ اہل سنت کا نقطۂ نگاہ یہ ہے کہ جو شخص اسی حالت میں وفات پا جائے، اس کا معاملہ مشیت الٰہی کے سپرد ہے کہ چاہے تو باری تعالیٰ اسے اپنے لطف و کرم سے بخش دے اور چاہے تو اسے اپنے عدل وانصاف کی بنا پر عذاب دے، تا آنکہ وہ اپنے گناہوں سے پاک صاف ہوکر جنت میں داخلے کا مستحق ہو سکے۔ لیکن اباضی فرقے کے پیروکاروں کے نزدیک گناہگار دائمی جہنمی ہے۔ اس طرح وہ بقیہ خوارج اور معتزلہ سے متفق ہو جاتے ہیں، جو فاسق وعاصی کے ابدی دوزخی ہونے کے قائل ہیں۔

● یہ لوگ گناہگار موحدین کے لیے شفاعت کے منکر ہیں‘ کیونکہ وہ ان کے عقیدے کے مطابق ہمیشہ ہمیش جہنم ہی میں رہیں گے اور انہیں کوئی ایسی شفاعت حاصل نہ ہوگی جس سے وہ دوزخ سے چھٹکارا پاسکیں۔

● اباضی‘ امام (حکمران) کے لیے قرشیت کی شرط کی نفی کرتے ہیں کہ ہر مسلمان اس کا اہل ہے بشرطیکہ اس میں مطلوبہ اوصاف موجود ہوں۔ ایسا امام جو اپنے فرائض اور شرعی ذمہ داریوں سے منحرف ہوجائے اسے معزول کرکے کسی دوسرے کواس کی جگہ مقرر کردینا چاہیے۔

● اباضیوں میں سے بعض لوگ امیر المؤمنین سیدنا عثمان بن عفان‘ سیدنا معاویہ بن ابی سفیان اور سیدنا عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم کوسخت جرح وتنقید کا نشانہ بناتے ہیں۔

● ان کے مذہب میں وصیت کے ذریعے امامت کا انعقاد باطل ہے۔امام کا انتخاب محض بیعت ہی کی صورت میں ہوسکتا ہے۔مختلف علاقوں میں ایک سے زائد امام بھی ہوسکتے ہیں۔

یہ ظالم حکمران کے خلاف خروج کو فرض قرار دیتے ہیں نہ ممنوع‘ بلکہ اسے درجہ جواز پر رکھتے ہیں۔جب حالات سازگار ہوں اور نقصان کا اندیشہ کم ہوتو یہ جواز وجوب کی طرف مائل ہوجاتا ہے۔لیکن جب حالات موافق نہ ہوں‘ متوقع نقصان زیادہ ہو اور نتائج بھی زیادہ مثبت نظر نہ آرہے ہوں تو پھر خروج وبغاوت کا جھکاؤ جواز سے زیادہ ممانعت کی طرف ہوجاتا ہے۔بہرحال خروج کسی بھی صورت میں ممنوع نہیں اور جب تک ظالم حکمران مسلط ہوتو الشراء (یعنی اپنے عقیدے کو چھپالینا) ہی بہتر ہے۔

● اکثر فقہی مذاہب کے برخلاف اباضی نقطۂ نظر کے مطابق دادا‘ نانی کی نسبت حضانت کا زیادہ حق رکھتا ہے۔ان کا کہنا ہے کہ دادا کی موجودگی میں میت کے بھائی وراثت سے محروم ہوں گے جبکہ بعض دوسرے مسالک کے نزدیک بھائی بھی دادا کے ساتھ شریکِ میراث ہوں گے۔

● فرقہ اباضیہ کے متبعین کا خیال ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے لیے جنت کی بھلائی اور اس سے متعلقہ امور کی دعا نہیں کرسکتا اِلا یہ کہ وہ (دوسرا) شخص دین پر کامل طریقے سے عمل پیرا ہو اور اپنی اطاعت و فرمانبرداری سے ولایت الٰہی کا مستحق ہو۔البتہ دُنیوی بھلائیوں یا ایسے اُمور کی دعا جن سے انسان اُخروی کامیابی کا حقدار بن سکے‘ یہ ہر مسلمان کے لیے جائز ہے خواہ پرہیزگار ہو یا خطاکار۔

● **حلقة العزابة** کے نام سے انہوں نے ایک نظام تشکیل دے رکھا ہے جو دراصل علم وصلاحیت میں ممتاز ترین افراد پر مشتمل ایک ڈھانچہ ہوتا ہے۔ان افراد کی تعداد محدود ہوتی ہے۔یہ اباضی معاشرے کے دینی‘ تعلیمی‘ اجتماعی اور سیاسی امور کی مکمل نگرانی کرتے ہیں۔غلبہ وتسلط کے زمانے میں یہ لوگ مجلس شوریٰ کی صورت میں کام کرتے ہیں اور ظلم وجبر یا ضعف ومغلوبیت کے دور میں جبکہ اپنے عقائد کا اخفاء ہی مناسب ہوتا ہے‘ یہ افراد ایک حکمران کی ذمہ داریاں نبھاتے ہیں۔

● اباضیوں کے ہاں 'ایروان' نامی ایک تنظیم بھی کام کرتی ہے جو مجلس مشاورت کے طور پر 'العزابة' کی معاونت کرتی ہے اور یہ اس کے بعد دوسری بڑی قوت شمار ہوتی ہے۔ یہ لوگ زکوٰۃ کی وصولی اور اسے فقراء میں تقسیم کرنے کے لیے کمیٹیاں تشکیل دیتے ہیں جو اس کام کے ساتھ ساتھ عام لوگوں کو زکوٰۃ یا صدقہ وخیرات مانگنے یا کسی بھی طرح دست سوال دراز کرنے سے سختی سے روکتی ہیں۔

● فرقہ اباضیہ سے مزید کئی فرقوں نے جنم لیا جو مرورِ زمانہ سے مٹ کر محض اوراقِ کتب میں محدود ہو کر رہ گئے۔ ان کے نام یہ ہیں:

...... **الحفصية** : یہ حفص بن ابی المقدام کے پیروکار تھے۔

...... **الحارثية** : ان کی نسبت الحارث الاباضی کی طرف کی جاتی ہے۔

...... **اليزيدية** : یہ فرقہ یزید بن انیسہ سے منسوب ہے۔ اس بدبخت کا گمان تھا کہ اللہ تعالیٰ عنقریب عجم میں ایک رسول بھیجے گا اور اس پر آسمان سے کتاب نازل فرمائے گا' لہٰذا وہ شریعت محمد ﷺ کو منسوخ کردے گا۔

لیکن تمام اباضیوں نے ان سے اظہارِ براءت کیا اور ان کے حد سے تجاوز کرنے پر انہیں کافر قرار دیا۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ لوگ اصل اباضی مسلک سے بہت دور چلے گئے ہیں جو کہ آج تک چلا آرہا ہے۔

☆ اباضی فکر وعقیدہ کی اساسات

● اباضی' قرآن وسنت (مسند الربیع بن حبیب) رائے اور اجماع کو قابل اعتماد گردانتے ہیں۔

● یہ اہل ظاہر کے زاویۂ نگاہ سے متاثر ہیں کہ بعض دینی نصوص کی بالکل لفظی اور ظاہری تفسیر کرتے ہیں۔

● خلق قرآن کے باب میں یہ معتزلہ سے متاثر ہیں۔

● ان میں سے بعض علماء فقہی مسائل پر بحث کرتے ہوئے احناف' مالکیہ' شافعیہ اور حنابلہ کی آراء کو بھی بلاحیل وحجت قابل استناد قرار دیتے ہیں۔

● کتاب 'النيل وشفاء العليل' ان کے اہم مراجع میں شمار ہوتی ہے' جس کی شرح الشیخ محمد بن یوسف اطفیش (متوفی ۱۳۳۲ھ) نے کی ہے' یہ اباضی فقہ اور عقائد کا مجموعہ ہے۔

☆ اباضی مذہب کی ترویج واشاعت / حلقۂ اثر

● اباضیوں کا رعب ودبدبہ اور اثر ونفوذ جزیرۂ عرب کے دونوں جنوبی کناروں میں تھا' حتیٰ کہ یہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ تک جا پہنچے۔ شمالی افریقہ میں ان کا مذہب بربر کے درمیان پھیلا۔ ''الدولة الرستميه'' کے نام سے ان کی ایک مستقل سلطنت تھی' جس کا دار الحکومت ''تاہرت'' تھا۔

● شمالی افریقہ پر ان کی مسلسل اور مستقل حکومت تقریباً ایک سو تیس برس قائم رہی تا آنکہ فاطمیوں

(عبیدیوں) نے ان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

● عمان میں بھی ان کی مستقل سلطنت قائم ہوئی' جس پر آج تک اباضی فرماں روا حکومت کر رہے ہیں۔

● ان کا ایک اہم تاریخی مقام' جبل نفوسہ ہے جو لیبیا میں واقع ہے۔ اسے ان کے ہیڈکوارٹر یا قلعہ کی حیثیت حاصل تھی کہ یہیں سے اباضی مذہب کی نشر واشاعت ہوتی تھی۔

● دورِ حاضر میں بھی اباضی مسلک کے پیروکار دنیا کے مختلف خطوں میں موجود ہیں' ان کی غالب تعداد عمان میں ہے۔ علاوہ ازیں لیبیا' تیونس' الجزائر اور زنجبار (تنزانیہ) میں بھی اس فرقے کے ماننے والے سکونت پذیر ہیں۔

اباضیہ کے بارے میں خود انہی کی زبانی جاننے کے لیے وزٹ کریں: www.istiqama.net

❁❁❁

بقیہ: حرفِ اوّل

(۱) سوات و وزیرستان میں فوجی آپریشن فی الفور بند کیا جائے اور گفت وشنید کے ذریعے صلح کی کوششیں کی جائیں۔ اب تو حکومت کے بقول سوات میں اس کی رٹ بھی قائم ہو چکی ہے' لہٰذا اسے سنجیدہ طور پر اس کا مظاہرہ کرنا چاہیے' ورنہ سوات آپریشن سے متاثر ہزاروں نوجوان انتقامی جذبے کے تحت مسلح کارروائیوں کی تحریک کا حصہ بن سکتے ہیں۔

(۲) لال مسجد کے واقعے کے ذمہ داران کو عدالتی کارروائی کے ذریعے قرار واقعی سزا دی جائے۔

(۳) امریکہ کی حمایت فی الفور بند کرتے ہوئے غیر جانبدار ممالک کی پالیسی کو اختیار کیا جائے اور پاکستانی علاقوں میں ڈرون حملوں کو کسی صورت برداشت نہ کیا جائے۔

(۴) بریلوی' دیوبندی اور اہل حدیث علماء کو اعتماد میں لیا جائے اور ان کے ذریعے پاکستان کی جہادی تحریکوں کو پرامن نفاذِ اسلام کی راہ پر گامزن کیا جائے۔

(۵) شریعت اسلامیہ کے حقیقی نفاذ کی طرف قرار واقعی پیش رفت کی جائے۔

نظر یہ آ رہا ہے کہ انتقام کی اس آگ کو اب کوئی شرعی دلیل ٹھنڈا نہیں کر سکتی۔ یہ آگ بھڑک اٹھی ہے اور ہمارے اپنے ہی گھر' ملک' قوم وملت کا احاطہ کر رہی ہے۔ یہ آگ پھیل رہی ہے اور بدقسمتی سے اصحابِ اقتدار آپریشن وریاستی جبر کے راستے اس آگ کو مزید ایندھن فراہم کر رہے ہیں۔ ہم نے بنگلہ دیش میں بھی بزور بازو اس آگ کو بجھانے کی کوشش کی تھی جس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔ اس آگ کو ٹھنڈا کرنے کا حل وہی ہے جو ہم نے بیان کر دیا ہے۔ حکومت اگر ملک وملت اور عوام کی بھلائی چاہتی ہے تو اسے اپنے رب کے حضور فرمانبرداری کا سجدہ کرنا ہوگا۔ اصحاب اقتدار کو اگر واقعتاً امن وامان قائم کرنا ہے تو انہیں عدل وانصاف کے سامنے جھکنا پڑے گا' کیونکہ بعض اوقات رفعت' تواضع ہی سے ملتی ہے۔ ○○

تعارف وتبصرہ

نام رسالہ : ماہنامہ رشد قراءات نمبر (حصہ اوّل)

پیشکش : كلية القرآن الكريم والعلوم الاسلاميه (جامعہ لاہور الاسلامیہ)

ضخامت:720 صفحات قیمت:150 روپے

ملنے کا پتہ: ☆J-99 ماڈل ٹاؤن لاہور ☆91۔ بابر بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن لاہور

ہر دور میں دشمنانِ دین اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہے ہیں اور ان کی سازشوں کا دائرہ زیادہ تر رسول اللہﷺ کی ذاتِ گرامی اور قرآن کریم کے گرد گھومتا رہا ہے۔ آپﷺ کی ذاتِ گرامی کو کئی طرح طعن کا نشانہ بنایا گیا۔ کبھی آپﷺ کو قتل وغارت کا پیامبر کہا گیا' کبھی آپﷺ کے تعددِ ازدواج کے مسئلہ پر نکتہ چینی کی گئی' اور ماضی قریب میں تو مغرب نے اس ضمن میں انتہائی ذلیل حرکات کا ارتکاب کیا ہے۔ اسی طرح قرآن کریم پر یہ بہت بڑا اعتراض اٹھایا جاتا ہے کہ یہ لوگوں کو قتل وقتال' غارت گری' دہشت گردی اور بنیاد پرستی کی تعلیمات دیتا ہے۔ اسی لیے اغیار ہر دور میں اس کوشش میں رہے ہیں کہ کسی طرح قرآن کریم کی صحت اور نسبت کو مشکوک کر دیا جائے' تاکہ ایک تو مسلمانوں کا ہر وقت ہمارے سروں پر منڈلاتا ہوا یہ چیلنج کہ قرآن دنیا کی واحد کتاب ہے جس کا آج تک ایک شوشہ بھی نہیں بدلا جاسکا' ٹل جائے' اور دوسرا قرآن کریم کی تعلیمات پر مزید ہرزہ سرائی اور یاوہ گوئی کا دروازہ کھل سکے۔ اس بارے میں ہم اتنا ہی کہیں گے کہ ع

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا!

قرآن کریم کی صحت میں تشکیک پیدا کرنے کے لیے غیر مسلم مفکرین (متعصبین) نے سب سے زیادہ جس چیز کو اچھالا ہے وہ قراءاتِ قرآنیہ ہیں۔ اس پر آرتھر جیفری' گولڈ زیہر اور نولڈکے وغیرہ مستشرقین نے باقاعدہ کتابیں لکھی ہیں' اور مختلف قسم کے اعتراضات پیدا کر کے ان قراءات کو بے اصل ٹھہرانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن علمائے دین نے اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے اس کا پورا پورا دفاع کیا ہے اور ان کے جوابات میں باقاعدہ مفصل مقالات تحریر فرمائے ہیں۔

افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض نام نہاد مسلم سکالرز (جن میں پرویز' تمنا عمادی اور اشراقی فکر کے علمبرداران شامل ہیں) بھی اس فکری جنگ میں مسلمانوں کی بجائے مستشرقین کے شانہ بشانہ کھڑے نظر آتے ہیں اور وہ بھی بالکل انہی کی طرح قراءاتِ متواترہ کا برملا انکار کرتے ہیں' حتیٰ کہ انہوں نے وہ تمام متواتر احادیث جو ثبوتِ قراء ات کے لیے دلیل ہیں ان کا بھی انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ علمائے حقہ ان کے خلاف بھی کمربستہ ہوئے اور ان کے بے جا اعتراضات کا مدلل جواب دیا۔

علماء کرام وقتاً فوقتاً ان موضوعات پر قلم اٹھاتے رہتے ہیں اور آرتھر جیفری' گولڈ زیہر اور نولڈکے کے فکری جانشینوں کو ان کا اصلی چہرہ دکھاتے رہتے ہیں' لیکن اب تک یہ سارا کام منتشر تھا اور اس کو جمع کرنے کی ضرورت تھی۔ نیز علومِ قرآن میں سے جن علوم کا تعلق براہِ راست قراءات سے ہے ان کے تعارف کی بھی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی تاکہ عوام بھی ان علوم سے متعارف ہو کر خدمت قرآنی کے سلسلہ میں سلف کی محنتوں کا اندازہ کر سکیں۔ ایک اہم ضرورت اس بات کی بھی تھی کہ علماء اہل سنت کے مابین علمِ قراءات کے جو علمی و فکری موضوعات کسی حد تک مختلف فیہ ہیں یا ان کے بارے میں ابھی کوئی واضح رائے نہیں پائی جاتی انہیں بھی موضوعِ بحث بنایا جائے تاکہ کسی حتمی رائے تک پہنچا جا سکے۔

ان تمام ضروریات کو سامنے رکھتے ہوئے کلیۃ القرآن الکریم والعلوم الاسلامیہ (جامعہ لاہور الاسلامیہ) نے ایک بڑا اہم قدم اٹھایا اور طلبہ کے مجلّہ ماہنامہ رشد کا قراءات نمبر (حصہ اوّل) شائع کیا ہے۔ اس شمارے میں تعارفِ علومِ قراءات (مثلاً علم رسم' علم ضبط' علم عدّ الآی) اختلافِ قراءاتِ قرآنیہ اور مستشرقین' قراءات کے بارے اصلاحی اور غامدی موقف' سبعہ احرف سے مراد' احادیث مبارکہ میں وارد شدہ قراءات' احادیثِ رسول کی روشنی میں ثبوتِ قراءات' تمنا عمادی کے نظریات کا جائزہ' قرآن اور قراءات کے ثابت ہونے کا ذریعہ' قراءاتِ قرآنیہ کا مقام اور مستشرقین کے شبہات' قراءاتِ عشرہ کی اسانید اور ان کا تواتر' مسئلہ خلط قراءات اور علم تحریرات کا فنی مقام جیسے عنوانات شامل ہیں۔ مزید برآں ایک نہایت اہم مقالہ شاملِ اشاعت ہے جو یقیناً بہت محنت سے تیار کیا گیا ہے اور اس میں مختلف قراءات میں پوری دنیا کے مختلف ممالک سے شائع ہونے والے ۲۳ مصاحف (قرآن کریم) کا تعارف مع سرورق کے عکس کے شائع کیا گیا ہے۔ نیز برصغیر پاک و ہند میں تجوید و قراءات کا آغاز کس طرح ہوا اور کن ہستیوں نے کیا' ان کا تعارف اور موجودہ دور کے کبار اساتذۂ قراءات کے انٹرویو بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔ ایک انتہائی لائق ستائش کام یہ کیا گیا ہے کہ ۱۹۳۳ء سے لے کر آج تک تجوید و علم قراءات پر تحریر شدہ ۴۰۰ سے زائد مضامین کا اشاریہ پیش کر دیا گیا ہے۔ جناب مدیر کے ادارتی نوٹس اور نائب مدیر کے اداریہ نے اسے یقیناً چار چاند لگا دیے ہیں۔ یاد رہے کہ یہ جمیع مقالات مصر' پاکستان' سعودی عرب کے معروف اہل علم کے علاوہ کلیۃ القرآن کے وابستگان کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ انتہائی محنت کے باوصف بھی بعض پہلو تشنہ رہ گئے ہیں۔ مثلاً فہرست عنوانات شائع کرنے میں شدید بخل سے کام لیا گیا ہے اور بعض اہم مقالات کے نام فہرست میں موجود نہیں ہیں۔ مزید یہ کہ بعض شخصیات کا تعارف پیش کرتے ہوئے تساہل سے کام لیا گیا ہے اور درست معلومات بہم نہیں پہنچائی گئیں۔ ایک عجیب چیز جو اس مجلّہ میں بار بار دیکھنے میں آئی وہ ناموں کے ساتھ لکھے گئے دعائیہ کلمات ہیں۔ بعض زندہ اور فوت شدہ شخصیات کے لیے ایک ہی طرح کے کلمات لکھے گئے ہیں' مثلاً رضی اللہ عنہ' رحمۃ اللہ علیہ وغیرہ۔ اس کا باعث شاید کوئی تکنیکی غلطی ہے۔ ہماری ایک تجویز ہے کہ منکرین قراءات کے بارے میں علماء کے فتاویٰ جمع کر لیے جائیں اور انہیں حصہ دوم میں شامل اشاعت کیا جائے۔ بہر حال قراءات نمبر (حصہ اول) علم قراءات کے موضوع پر ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اللہ ربّ العزت احباب کلیۃ القرآن الکریم والعلوم الاسلامیہ کی اس علمی کاوش کو قبول فرمائے۔ آمین!

(تبصرہ نگار: حافظ فہد اللہ مراد)

(۲)

نام کتاب : مولانا عبدالستار خان نیازی (مجاہدِ ختمِ نبوت، غازی ختم نبوت)

مؤلف ومرتب : محمد صادق قصوری

ضخامت: 272 صفحات سال اشاعت: فروری 2008ء ہدیہ: دعائے خیر بحق معاونین فاؤنڈیشن

عقیدۂ ختم نبوت اسلام کے بنیادی ترین عقائد میں شامل ہے اور اسے تسلیم کیے بغیر کوئی شخص مسلم نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ رسول اکرم ﷺ نے پیشین گوئی فرمائی تھی، مختلف زمانوں میں کچھ راندۂ درگاہ لوگ قصرِ نبوت میں نقب زنی کی ناکام اور ناپاک جسارت کرتے رہے ہیں۔ انہی میں متنبیِٔ ہند مرزا غلام احمد قادیانی کا نام بھی شامل ہے۔ مرزائے قادیان کے دعوائے نبوت کا علمائے اسلام نے سخت نوٹس لیا اور اس کی تردید میں علمی و عملی ہر دو پہلوؤں سے انتھک جدوجہد کی، جس کے نتیجے میں آئین پاکستان کی رو سے قادیانیوں کو باقاعدہ غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔

تحفظ ختم نبوت کی اس عظیم تحریک میں مولانا عبدالستار خان نیازیؒ کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا نیازی تحریک ختم نبوت میں اس قدر متحرک اور فعال تھے کہ حکومتِ وقت نے ایک فوجی عدالت کے ذریعے آپ کو اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کو سزائے موت دینے کا فیصلہ سنا دیا۔ اس فیصلے پر ان حضرات کے پائے استقلال میں ہلکی سی لغزش بھی نہ آئی اور یہ پوری استقامت سے اپنے موقف پر ڈٹے رہے۔ ان حضرات کی سزائے موت بعد ازاں عمر قید میں تبدیل کر دی گئی۔ اندرون ملک عوامی احتجاج اور بیرون ملک اسلامی ممالک کی حکومتوں کے دباؤ کے باعث آخرکار حکومت کو انہیں رہا کرنا پڑا۔

محمد صادق قصوری صاحب نے تحریک ختم نبوت کے سلسلے میں مولانا نیازی کے کردار سے متعلق خود مولانا کی اپنی اور دیگر اربابِ قلم کی نگارشات کو مرتب کر کے کتابی شکل میں پیش کر دیا ہے جس سے مولانا نیازی مرحوم کی شخصیت کے انقلابی رخ، ان کی محبت رسول ﷺ اور تحریک کے مختلف پہلوؤں سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔
کتاب درج ذیل پتے سے 40 روپے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کی جاسکتی ہے:

مجاہد ملت فاؤنڈیشن، برج کلاں ضلع قصور (پاکستان) پوسٹ کوڈ: 55051

(تبصرہ نگار: حافظ ابوعمرو عسکری)

MESSAGE OF THE QUR’AN

Translation and Brief Elucidation

By

Dr. Israr Ahmad

Al-Baqarah

(Ayaat 86-103)

أُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۫ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٨٦﴾

(86) *They are the ones who have purchased the worldly life at the cost of the Hereafter. So neither punishment would be mitigated from them, nor would they be helped.*

i.e. they prefer the life and attractions of this world to the Hereafter. Therefore, their punishment will never end and they will not find any helper to save them from the eternal torment in the Hell.

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ۫ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ
الْقُدُسِ ۭ اَفَكُلَّمَا جَاۗءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ ۚ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ۡ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿٨٧﴾

(87) *And indeed We gave Moses the Book (Torah) and followed him up with a succession of messengers. And We gave ‘Eesa--son of Mary, clear signs and supported him with the Holy Spirit. Why is it then that whenever came to you a Messenger with what you desired not, you became arrogant? So a group (of Prophets) you belied and a group you killed.*

Allah sent Messengers and Prophets after *Musa* (AS), who followed his Law, and then Allah sent the last Prophet among the *Children of Israel* i.e. *‘Eesa* (Jesus) (AS), the son of Mary (AS), and the continuous chain of Prophets among the *Children of Israel* came to a halt after nearly fourteen hundred years. *“And We gave ‘Eesa--son of Mary, clear signs”*. Alongwith *Injeel*, Allah gave great miracles to *‘Eesa* (AS), which included bringing the dead back to life, forming the shape of birds from clay and blowing into them after which they would become living birds by Allah’s leave, healing the sick and foretelling the Unseen.[22] “*And supported him with the Holy Spirit”*. The ‘Holy Spirit’ here signifies the angel *Jibreel* (AS) who brought this revelation. “*Why is it then that whenever came to*

you a Messenger with what you desired not, you became arrogant? So a group (of Prophets) you belied and a group you killed". Prophets were sent to the *Children of Israel* with clear signs and miracles, but instead of believing in them, they became more defiant and treated them in the worst manner, rejecting some of them and killing the others, like *Yahya* (AS) (John the Baptist) and *Zakariyah* (AS). They did all this because the Prophets commanded them to follow what was against their own desires.

وَقَالُوا قُلُوبُنَا غُلْفٌ ۚ بَل لَّعَنَهُمُ اللَّهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ ﴿٨٨﴾

(88) *And they said: "Our hearts are wrapped up". Instead Allah has cursed them for their disbelief. So they believe just a little.*

They used to say that their hearts were wrapped up in covers and sealed. By saying this, they meant that they had knowledge about everything and did not need the knowledge that the Prophet (SAW) claimed to receive from Allah (SWT) and that his preaching was not going to affect their hearts the least bit. Allah says that they are under His curse and that He has sealed their hearts because of their arrogance and deviance. *"So they believe just a little"* i.e. they do not believe in the real sense.

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوا مِن قَبْلُ يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا
جَاءَهُم مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ ۚ فَلَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الْكَافِرِينَ ﴿٨٩﴾

(89) *And when there came to them a Book from Allah confirming that which was with them, whereas prior (to it), they used to ask for victory over those who disbelieved. But when there came to them what they recognized, they disbelieved therein. So the curse of Allah is upon the disbelievers.*

This means that the *Qur'an* which Allah sent down to Muhammad (SAW), came confirming what was with them i.e. the previous Books, *Torah* and *Injeel*. The *Children of Israel* were foretold in their scriptures about the coming of the last Prophet, Muhammad (SAW). They used to invoke Allah to aid them through his arrival, so that he could end the dominance of the unbelievers. They used to say to the unbelievers, "A Prophet shall be sent before the end of this world and we, with his help, will defeat you." But when Allah sent Prophet Muhammad (SAW), they rejected him, denying what they used to say about him, and lied that he was not the Prophet they had been talking about, and that he had not brought anything that they recognized. That is why Allah says, *"The curse of Allah is upon the disbelievers".*

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهِ أَنفُسَهُمْ أَن يَكْفُرُوا بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ بَغْيًا أَن يُنَزِّلَ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ

عِبَادِهِۦ ۖ فَبَآءُو بِغَضَبٍ عَلَىٰ غَضَبٍ ۚ وَلِلْكَٰفِرِينَ عَذَابٌ مُّهِينٌ ﴿٩٠﴾

(90) *Evil is that whereby they have bartered their souls--that they reject what Allah has sent down, grudging that Allah should send down from His Blessing upon whomsoever He wills out of His bondsmen. So they drew upon themselves wrath upon wrath. And for the disbelievers there is a humiliating punishment.*

The Jews knew that Prophet Muhammad (SAW) was the Prophet they had been waiting for, but they hid the truth about him which was present in their books. Therefore, Allah says that they have bartered the truth for falsehood, which indeed is an awful deal. The Jews thought that because they were the best of all human races, and most of the previous Prophets had been sent to them, Allah would send the last Prophet from within them as well, but when Allah sent a Prophet from among a different people (Arabs), whom they despised, they decided to reject him because of their envy and grudge *"that Allah should send down from His Blessing upon whomsoever He wills out of His bondsmen"*. Further Allah says, *"So they drew upon themselves wrath upon wrath"*, meaning that they acquired Allah's anger when they denied *'Easa* (AS) and multiplied it by rejecting Muhammad (SAW). *"And for the disbelievers there is a humiliating punishment"* i.e. there will be disgrace and humiliation for them in this world as well as in the Hereafter.

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ ءَامِنُوا۟ بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ قَالُوا۟ نُؤْمِنُ بِمَآ أُنزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُونَ بِمَا وَرَآءَهُۥ وَهُوَ ٱلْحَقُّ مُصَدِّقًا
لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُونَ أَنۢبِيَآءَ ٱللَّهِ مِن قَبْلُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩١﴾

(91) *And when it is said to them: "Believe in what Allah has sent down", they say: "We believe in that which has been sent down to us", and they reject whatever is beyond it; although it is the truth confirming that which is with them.Say: "Then why have you been killing the prophets of Allah prior (to it) if you were believers"?*

i.e. when the Jews and the People of the Book are asked to believe in what has been revealed to Muhammad (SAW) and to follow him, they say that they will only follow their own books, and that is enough for them to believe in. Allah says, *"Although it is the truth confirming that which is with them"* i.e. they know that it is the truth, and what has been revealed to Muhammad (SAW) confirms the scriptures given to them. Further Allah says, *Say: "Then why have you been killing the Prophets of Allah prior (to it) if you were believers"?*

i.e. if you say that you only believe in the Prophets of your own race and what was revealed to you, then what about the Prophets We sent to you? They were all from among yourselves and

brought scriptures from your Lord, but still you did not believe in them and killed them.

وَلَقَدْ جَآءَكُم مُّوسَىٰ بِالْبَيِّنَـٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِن بَعْدِهِۦ وَأَنتُمْ ظَـٰلِمُونَ ﴿٩٢﴾

(92) *And indeed Musa came to you with clear signs, then you took the calf (for worship) after him--and you were unjust.*

Musa (AS) came with clear signs and miracles and with the message that no deity is worthy of worship except Allah, but as soon as he left for Mount Sinai, the *Children of Israel* started worshipping the calf, which they had made with their own hands, and thus became unjust.

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَـٰقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَآ ءَاتَيْنَـٰكُم بِقُوَّةٍ وَاسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا
وَأُشْرِبُوا فِى قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِۦٓ إِيمَـٰنُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾

(93) *And when We took a covenant from you and raised over you the Mount (saying): "Hold fast to what We have given you and listen. They said: "We listened and we disobeyed." And they were made to imbibe in their hearts (the love of) the calf due to their disbelief. Say: "Evil is that which your faith commands you if you are believers".*

Allah reminds the Jews of their breaking the covenant He had taken from them, and the transgression they made when Allah lifted Mount Sinai over their heads and commanded them to obey and follow the *Torah* which was revealed to *Musa* (AS). They should have said, "We have heard and we submit ourselves to your commandment", but instead they changed the words and said, "We have heard but we will not obey." This was because, *"they were made to imbibe in their hearts (the love of) the calf due to their disbelief".* Then Allah says, *Say: "Evil is that which your faith commands you if you are believers",* meaning, how can you claim that you believe, while you have committed the evil of breaking the covenant, disbelieving in Allah's *Ayaat*, rejecting and killing the Messengers and worshipping the calf instead of Allah?

قُلْ إِن كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْـَٔاخِرَةُ عِندَ اللَّهِ خَالِصَةً مِّن دُونِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَـٰدِقِينَ ﴿٩٤﴾

(94) *Say: "If the Home of the Hereafter with Allah is purely for you excluding the (rest of) mankind, then wish for death if you are truthful.*

The Jews had an illusion that the Paradise is reserved for the *Children of Israel* alone and is not for the rest of the Mankind. The Muslims today have almost the same belief; they think that as they have been born as Muslims, they will by default enter the Paradise. But this, in reality, is exactly what the Jews had; nothing but an illusion. Allah says to the Jews that if they really think that they are the chosen ones and Paradise is their abode, they should long

for death. Those who really care for the Hereafter neither set their hearts on this worldly life nor are afraid of death. The condition of the Jews was and is the opposite of this.

وَلَن يَتَمَنَّوْهُ أَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ ﴿٩٥﴾

(95) *And certainly they will not wish for it ever, because of what their hands have sent ahead. And Allah is Well-Aware of the unjust people.*

Allah asked the Jews to invoke death if they were truthful, but they did not and have never accepted the challenge, as they know that what they claim is all false. Had they been truthful, they would have accepted the challenge. They know what they have earned and forwarded to the Hereafter, and thus they wish that they could delay it as much as possible. *"And Allah is Well-Aware of the unjust people".*

وَلَتَجِدَنَّهُمْ أَحْرَصَ النَّاسِ عَلَىٰ حَيَاةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا ۚ يَوَدُّ أَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ أَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهِ مِنَ الْعَذَابِ أَن يُعَمَّرَ ۗ وَاللَّهُ بَصِيرٌ بِمَا يَعْمَلُونَ ﴿٩٦﴾

(96) *And definitely you will find them the greediest of mankind for life, even greedier than the polytheists. Each one of them wishes that he could be given a life of a thousand years. But the grant of such a life will not save him from the punishment. And Allah is Watchful over what they do.*

The Jews know what evils they have done and what reward they are going to get from their Lord. Therefore, they are so keen to remain alive, even more so than the infidels and the pagans who do not have a Divine Book, that they do not care whether they live honorably or with humiliation. They wish that they could delay the Hereafter. But Allah says that a long life will not save them from the torment they are going to face, even if they could live for a thousand years. Everyone has to die and will get one's reward, and the Jews know that the only reward they will have with Allah is total loss and the severest of punishments, because *"Allah is Watchful over what they do".*

قُلْ مَن كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيلَ فَإِنَّهُ نَزَّلَهُ عَلَىٰ قَلْبِكَ بِإِذْنِ اللَّهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَبُشْرَىٰ
لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٩٧﴾

(97) *Say: "Whoever is an enemy to Jibreel, (must know) that obviously he has sent it down to your heart with the command of Allah, confirming what is before it, and guidance and glad tidings for the believers".*

The Jews believed that the last Prophet, prophesized in their scriptures would be among them, but when Allah sent Muhammad (SAW) as a Messenger from among the Arabs, they denounced angel

Jibreel (AS) as their enemy, because they believed that instead of bringing the revelation to one of the Jews, *Jibreel* had brought it to Muhammad (SAW). But Allah says that *Jibreel* (AS) is only His Messenger, and he brought the *Qur'an* to Muhammad's heart, only by Allah's command, "*confirming what is before it, and guidance and glad tidings for the believers*". Here it suggests that the actual enmity of the Jews was not directed towards *Jibreel* (AS) but against the revelation he brought which confirmed their scriptures. Had they believed in it, it would have been guidance and good tidings for them.

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿٩٨﴾

(98) *Whoever is an enemy to Allah, His angels, His Messengers, Jibreel and Michael, then verily Allah is an enemy to the unbelievers.*

Whoever believes in Allah is required to believe in all His Messengers. Whoever rejects any of His Messengers, in reality rejects Allah and all His Messengers, and whoever takes His Messengers as enemies has taken Allah as his enemy.

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿٩٩﴾

(99) *And indeed We have sent down to you clear Ayaat and no one denies them except the perverse.*

i.e. clear signs have been sent to Muhammad (SAW) which confirm his Prophethood, but the Jews reject it because of their envy and transgression.

اَوَكُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٠﴾

(100) *Has it not been the case that every time they made a covenant, a group of them threw it aside? But most of them do not believe.*

Allah reminds the *Children of Israel* about the covenants they broke, especially about Muhammad (SAW), about whom they were informed beforehand in their scriptures.

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ
ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٠١﴾

(101) *And when there came to them a Messenger from Allah, verifying that which was with them; a group among those who were given the Book threw the Book of Allah behind their backs as if they did not know.*

When Prophet Muhammad (SAW) came, the Jews disputed and questioned his Prophethood, and tried to prove their viewpoint from the *Torah*, but the fact was that the *Qur'an* revealed to

Muhammad (SAW) and their scriptures confirmed each other. Even though they recognized Prophet Muhammad (SAW) as well as they recognized their own sons, they abandoned the Holy Books and hid the facts because of their enmity and jealousy.

The Jews tried to deny the Prophethood of Muhammad (SAW), supposedly with the help of the *Torah*, but the *Torah* also confirmed the coming of the last Prophet, with the last of the Divine Books, the *Qur'an*. Therefore, they infact abandoned their own Books and took to the Book of Magic and Sorcery which of course did not conform to the *Qur'an*. That is why Allah revealed the following *ayah*.

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ
فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا
بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّھُمْ وَلَا يَنْفَعُھُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ڜ
وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَھُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ١٠٢

(102) And they followed that which the devils chanted (of sorcery) in the kingdom of Suleman. And Suleman did not disbelieve, but the devils disbelieved. They used to teach the people sorcery and that which was sent down to the two angels at Babylon--Harut and Marut--yet these two taught none until they had said: "Surely we are only a trial, so do not disbelieve." But they kept on learning from these two (the magic) whereby they used to cause separation between a man and his wife; and they were not to harm therewith anyone except with Allah's permission, and they learnt what would harm them and not profit them. And certainly they knew that whoever practice it shall have no share in (the enjoyments of) the Hereafter. And definitely vile is that whereby they have sold themselves; would that they had known!

The devils at the time of *Suleman* (Solomon) (AS) used to ascend to the heaven and eavesdrop on news regarding the Unseen matters. Then they would convey it to the soothsayers, who added a lot of lies in it. The soothsayers then recorded these words in books which were later on hidden by Prophet *Suleman* (AS). After his death, the devils tempted the people to dig out those books, buried under Prophet *Suleman's* throne. Then these devils made the *Children of Israel* believe that *Suleman* (AS) was a sorcerer and he ruled and controlled the kingdom with this magic (May Allah curse the Jews for what they say). When Allah revealed the *Qur'an*, the Jews disputed in these matters, and did not believe *Suleman* (AS) to be a Prophet of Allah. That is why Allah says that it was not *Suleman* (AS) who ruled with magic and sorcery. On the

contrary, the devils taught magic to people. And Allah sent two angels *Harut* and *Marut* to Babylon [23], who would teach the people magic, as a test for them, but they did not teach them anything without saying that it was a test from their Lord. When someone came to them to learn magic, they would discourage them and warn them that they would become disbelievers, but despite the warnings from the angels, the people continued to learn magic and indulge in evil acts, which included the separation of spouses. *"And they were not to harm therewith anyone except with Allah's permission"*, meaning, the sorcerers' magic never brings harm to anyone except by Allah's leave. *"And they learnt what would harm them and not profit them".* This in effect means that it harmed their religion even more, and did not benefit them at all. *"And certainly they knew that whoever practice it shall have no share in (the enjoyments of) the Hereafter"* i.e. they knew that it had been prohibited in the *Torah*, but still persisted with learning the magic. Thus Allah says, *"And definitely vile is that whereby they have sold themselves; would that they had known"!* This means that what they have preferred i.e. magic and sorcery, over faith and belief in the Messenger of Allah (SAW), is indeed a loss in this world and in the Hereafter, but they do not understand.

وَلَوْ أَنَّهُمْ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَمَثُوبَةٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ خَيْرٌ ۖ لَّوْ كَانُوا يَعْلَمُونَ ﴿١٠٣﴾

(103) And if they had believed and guarded themselves (against evil), the reward from Allah would have been definitely better; would that they could understand!

i.e. had they followed the Messenger and the Book of Allah, instead of the devils and their sorcery, they would have got a better reward in the Hereafter, but they had become so stubborn in their arrogance and deviance, that they did not understand.

Endnotes

[22] Ibid, narrated by Ibn Abbas.

[23] After the Jews were ousted from Jerusalem, during the reign of *Nabu Kad Nazar*, they settled in Babylon, and that is when Allah sent these angels to them.